مصحفِ تغزّل

علامہ نجم آفندی

تحقیق و تدوین:

ڈاکٹر سید تقی عابدی

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

کتاب	:	**مصحف تغزل**
تحقیق وتدوین اور تنقید	:	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی
سنہ اشاعت	:	2006ء
تعداد	:	1000
کمپوزنگ	:	افراح کمپیوٹر سنٹر نئی دہلی۔25
ایڈیشن	:	اوّل
باہتمام	:	**ڈاکٹر شاہد حسین**، نئی دہلی

یہ کتاب

مرتب محقق و ناقد ڈاکٹر **سیّد تقی عابدی** (کنیڈا) اور

ناشر **ڈاکٹر شاہد حسین**، شاہد پبلی کیشنز، 2253 دریا گنج، نئی دہلی (انڈیا)

کی اجازت سے شائع کی گئی

رَو میں ہے رخشِ عمر

نام	:	**سیّد تقی حسن عابدی**
ادبی نام	:	تقی عابدی
تخلّص	:	تقی
والد کا نام	:	سیّد سبط نبی عابدی منصف (مرحوم)
والدہ کا نام	:	سنجیدہ بیگم (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	:	یکم مارچ 1952ء
مقام پیدائش	:	دہلی (انڈیا)
تعلیم	:	ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا) ایم ایس (برطانیہ) ایف سی اے پی (یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ) ایف آر سی پی (کنیڈا)
پیشہ	:	طبابت
ذوق	:	شاعری اور ادبی تحقیق
شوق	:	مطالعہ اور تصنیف
قیام	:	ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک اور کنیڈا
شریک حیات	:	گیتی
اولاد	:	دو بیٹیاں (معصوما اور رویا) دو بیٹے (رضا اور مرتضیٰ)
تصانیف	:	شہید (1982ء) جوشِ مودّت۔ گلشن رویا۔ اقبالؔ کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاؔء۔ رموز شاعری۔ اظہار حق۔ مجتہد نظم مرزا دبیرؔ۔ طالع مہر۔ سلکِ سلام دبیرؔ۔ تجزیہ یادگار انیسؔ۔ ابواب المصائب۔ ذکر دُرباران۔ عروسِ سخن۔ مصحفِ فارسی دبیرؔ۔ مثنویاتِ دبیرؔ۔ کائنات نجم۔
زیر تالیف	:	تجزیہ شکوہ جواب شکوہ۔ رباعیات دبیرؔ۔ فانی شناسیؔ۔ مصحفِ تاریخ گوئی۔ روپ کنوار کماری۔ تعشق لکھنوی۔

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

دردِ دل

کس کس سے سوال کروں؟

علاّمہ نجم آفندی نے کہا تھا :

میں خود ہوں مطمئن اے نجم ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

① اردو کے مشاہیر شعرائے غزل نے نجم کی قدر دانی کیوں نہ کی؟
(195) عمدہ اور اعلیٰ ترین غزلوں کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟
کیا 1955ء کا آل انڈیا مشاعرہ یاد نہیں جس میں نجم نے مشاعرہ **لوٹ** لیا تھا؟ 0

② اردو کے ترقی پسند تحریک کے نمائندوں نے کیوں نجم کو نظر انداز کیا؟ اردو ادب میں کسان، مزدور، مزدوری اور سرمایہ داروں کے خلاف نظموں میں پہلی آواز علاّمہ اقبال اور جوش سے قبل نجم کے سوا کس نے بلند کی؟ اگر بقول سلیمان ندوی، حسرت موہانی اسلامی اور سوشلسٹ رجحان رکھ کر بیسویں صدی کے ابوذر غفاری ہوسکتے ہیں اور تحریک کے بھی پسندیدہ شاعر رہ سکتے ہیں تو نجم کی مسلمانی کیوں برداشت نہ ہوئی؟

③ نعت کے پرستاروں نے صدہا نعتیہ آبدار اشعار اور سولہ سے زیادہ نعتوں کو کیوں طاقِ نسیاں کے سپرد کیا؟
کیا نجم کے اس شعر میں کسی کو شک ہوسکتا ہے؟

اے نجم میں ہوں شاعرِ دربارِ رسالتؐ
کیا شک ہے کسی کو مری تصویر کشی میں

④ کیوں افسانہ نویسوں نے عمدہ افسانہ ''چور ماموں'' نہیں پڑھا؟ کیوں ناول نگاروں نے تخلیقی شاہکار ناول ''بندۂ خدا'' کو فراموش کیا؟

شریک حال نہ ہوتی جو نجم خودداری
ہمارے غم کا فسانہ غمِ جہاں ہوتا

⑤ اردو میں کتنے شاعر ہیں جنھوں نے نجم کی طرح چھ سو سے زیادہ عمدہ رباعیاں لکھیں؟ کیوں اردو رباعیات لکھنؤ کے پی ایچ ڈی (Ph.d) کے مقالے میں نجم کا نام تک نہیں؟ جبکہ پانچ اور دس رباعی کہنے والے افراد کا ذکر آب وتاب کے ساتھ ہے۔ کیا اس قسم کے مقالوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

⑥ شاعرِ اہلِ بیتؑ کا خطاب دے کر محبانِ اہلِ بیتؑ کیوں نجم سے غافل ہوگئے؟ مولویوں، خطیبوں نے منبر سے کیوں ان کا پیغام نہیں پہنچایا؟ سلاموں، نوحوں، مرثیوں کو لے کر دوسرے انقادی کلام کو کیوں تلف کردیا؟ کراچی میں اتنے بڑے شاعر کے جنازے میں کیوں صرف بیس (20) پچیس (25) افراد شریک ہوئے؟

⑦ کیوں نجم کے کلام کو محبانِ اہلِ بیتؑ، گروہانِ نوحہ خوان، پرستارانِ نجم، شاگردانِ رشید، عزیز و اقربا نے انتقال کے تیس (30) برسوں میں بھی شائع نہیں کیا؟ اگرچہ نجم نے کہا تھا:

ہم نجم چار روز کے مہمان ہیں مگر
رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

⑧ اردو ادیبوں اور تنقید نگاروں نے اس بیسویں صدی کے عظیم شاعر سے کیوں غفلت برتی؟ نجم کے (12799) اشعار، (195) غزلیں، (591) رباعیات، (498) قطعات، (16) نعتیں، (81) قصائد، (107) سلام، (144) نوحے، (83) متفرقات کے علاوہ (3) مرثیے، (18) ہندی کلام کے آثار اور کئی نثری کتابیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ موجود ہیں:

آج اردوے معلّٰی کی اشاعت کے لئے
یہ غنیمت ہے کہ نجم نکتہ داں باقی رہا

میں نے حقیقت کو پیش کیا ہے:

نجم بہتر ہے تصنّع کی دلآویزی سے
تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

⑨ کانگریس، مسلم لیگ اور دوسرے قومی سیاسی عہدے داروں نے ایسے وطن دوست شاعر کو وطن کی محبت میں کیا دیا؟ جبکہ

ع: منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

کائناتِ نجم ان تمام سوالوں کا جواب رکھتی ہے۔ صرف گردشِ اوراق شرط ہے۔ شاید یہ میری نجمی عقیدت اور اُردو محبت ہو۔ یہ ایک خوشگوار حادثہ تھا جس کے فیض سے میں کائناتِ نجم کو دریافت کرسکا:

یہ بھی اک حادثہ اُردو کی محبت کا ہے نجم
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

خیر اندیش

سیّد تقی عابدی

der\Graphic2
not found.

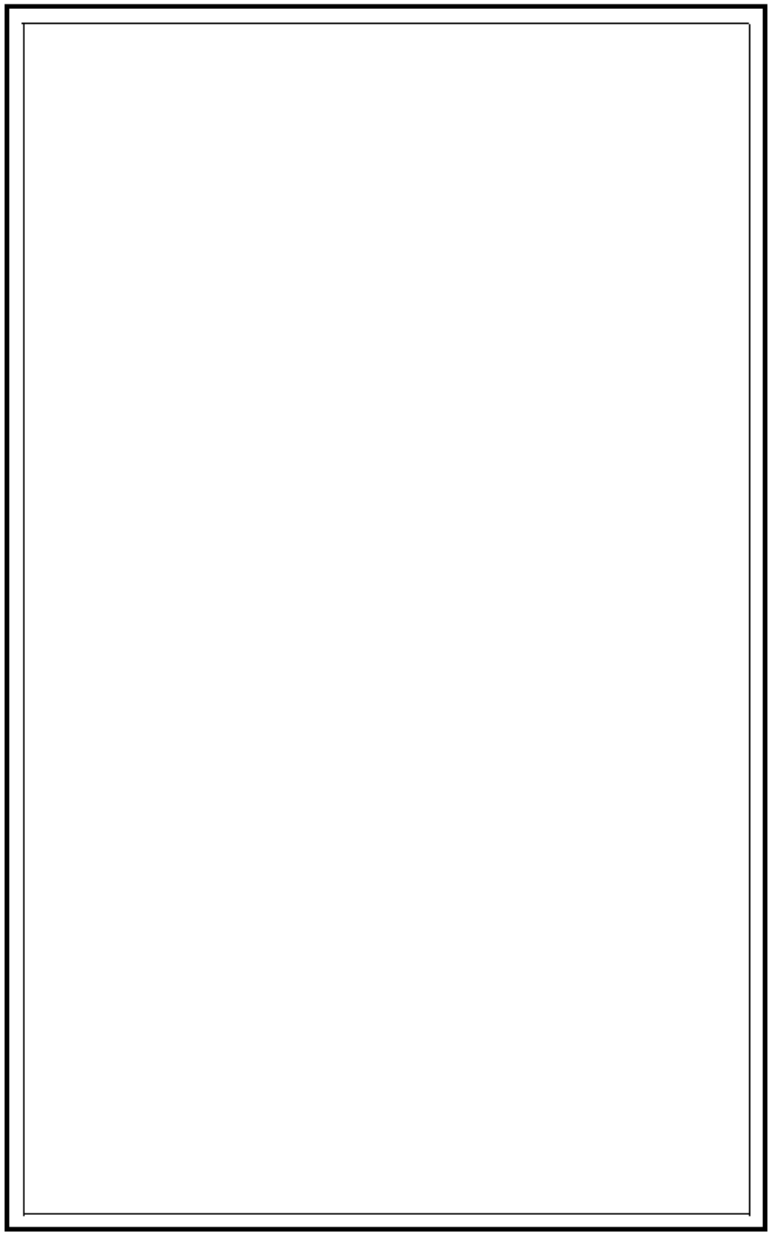

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

نجم آفندی کا زندگی نامہ

نام مرزا تجمل حسین
تخلص نجم۔ نجمی
شہرت نجم آفندی
گھریلو نام نادر مرزا

تاریخ ولادت: رمضان 1330 ہجری مطابق 1893ء

مقام ولادت: اکبر آباد (آگرہ) کٹرہ حاجی حسن جو پیپل منڈی کے پیچھے واقع ہے۔

والد مرزا عاشق حسین بزمؔ آفندی۔ معروف شاعر اپنے سگے ماموں سید اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی متوفی 1880ء کے شاگرد رہے۔ ان کی پیدائش 1860ء میں کٹرہ حاجی حسن آگرہ میں ہوئی۔ شادی آغا حسین صاحب صاحبِ دیوان شاعر کی بیٹی سے ہوئی۔ دوسری شادی ایک انگریز خاتون سے ہوئی۔ آپ بزمؔ تخلص کرتے تھے۔ معروف غزل گو اور مرثیہ گو شاعر تھے۔ بزمؔ آفندی کا انتقال 23 مارچ 1953ء کو ہوا۔

دادا مرزا عباس ملیح جو مرزا نجف علی بلیغؔ کے فرزند تھے جو مرزا فصیحؔ مشہور مرثیہ گو شاعر کے حقیقی بھائی تھے۔ اسی لیے تو نجمؔ آفندی نے مرزا فصیحؔ کی میراث پر فخر کرتے ہوئے فرمایا:

نجمؔ میں ہوں خاک پائے مسند آرائے فصیحؔ
مدح کی دولت ملی ہے ورثۂ اجداد سے

پردادا: مرزا ہادی علی فیض آبادی۔ مرزا ہادی علی کے تین فرزند تھے۔ (1) مرزا جعفر علی فتیح (2) مرزا نجف علی بلیغ (3) مرزا قتیح۔ ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم لکھتے ہیں۔ ''نجم آفندی کے پردادا ہادی علی فیض آبادی حضرت عقیل ابن ابی طالب علیہ السلام کی نسل سے تھے لیکن جب ان کے بزرگ بلاد ایران میں رہنے لگے تو وہاں ''مرزا'' مشہور ہوگئے تھے۔ ہندوستان میں آمد کے بعد ان کے بزرگ شاہجہاں آباد (دہلی) میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔

معز الدین قادری اسرار و افکار میں لکھتے ہیں۔ نجم آفندی کے پردادا مرزا ہادی علی فیض آباد کے محلّہ ''مغل پورہ'' میں رہتے تھے چنانچہ نجم آفندی نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

مرے بزرگوں کا اصلی وطن ہے فیض آباد
مجھے بھی شوق تھا دیکھوں میں یہ در و دیوار

اجداد: نجم آفندی کے اجداد ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے جو ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوئے۔

بھائی بہن: دو بھائی (1) مرزا اعجاز حسین مرحوم اکیس برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ یہ عمر میں نجم سے بڑے تھے۔

(2) مرزا سلیمان کوکب آفندی، چھوٹے بھائی جن کی صاحبزادی مشہور مرثیہ نگار شاعر باقر زیدی کی شریک حیات ہیں۔ ایک بہن شہزادی فرطیس بانو اختر جہاں کج کلاہ پروین پیدائش 1901 جو بزم آفندی کی دوسری انگریز بیوی کے بطن سے تھیں۔ پروین کج کلاہ عمدہ شاعرہ تھیں۔

شریکِ حیات: 1958ء میں گلے کی کینسر سے انتقال کر گئیں۔ کانپور کے ایک معزز گھرانے کی صاحبزادی تھیں۔

اولاد: (1) پانچ لڑکے۔ جن میں چار لڑکے عباس، کامران، تاجدار اور تسلیم بچپن میں مر گئے اور اکلوتے بیٹے ہمایوں مرزا المتخلص سہیل آفندی حیات ہیں اور حیدرآباد

دکن میں مقیم ہیں۔

(2) سات لڑکیاں۔ ایک بیٹی کا کمسنی میں انتقال ہوگیا۔ دوسری لڑکی ناکتخدا تھی۔ دو بیٹیاں شادی کے بعد پاکستان چلی گئیں اور دو بیٹیاں ہندوستان میں مقیم رہیں۔

تعلیم وتربیت: 1- نجم آفندی کی اردو اور فارسی تعلیم گھر پر ہوئی۔

2- قرآن مجید اپنے چچا مرزا ہادی علی سے پڑھا

3- مفید عام اسکول آگرہ سے انگریزی میں مڈل پاس کیا۔ اس اسکول میں اردو فارسی مولوی سلامت اللہ سے اور انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر راج کمار سے پڑھی۔

4- اسرار و افکار کے دیباچہ میں معز الدین قادری لکھتے ہیں۔ ''نجم آفندی کو اردو فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی درک ہے۔ ان کی ہندی زبان میں بھی تصنیفات ملتی ہیں۔''

5- ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی دبستان دبیر میں لکھتے ہیں۔ نجم آفندی اردو، فارسی اور عربی اچھی جانتے ہیں اور انگریزی میں بھی اچھا درک رکھتے ہیں۔

6- ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے نجم آفندی فکر وفن میں لکھا۔ ''اردو فارسی کی حد تک تو یہ بات درست ہے لیکن محض قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کو عربی تعلیم کا حصول سمجھ کر مالک رام اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو مغالطہ ہوا ہے۔ خود نجم آفندی نے اپنے خط میں عربی نہ پڑھ سکنے کے بارے میں لکھا ہے۔

7- اردو فارسی اور انگریزی کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا۔ انھیں گھر پر عام طور سے انگریزی ناول کو بھی مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا گیا۔

8- نجم آفندی شمشاد حسین کے نام خط میں لکھتے ہیں ''میری تعلیم اس زمانے کے مڈل تک ہوگی مگر کم ازکم انگریزی کی دو ہزار کتابیں ہر قسم کی میری نظر سے گزری ہیں۔

شکل وصورت: شکل وصورت تصویر سے ظاہر ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ نجم آفندی کا قد تقریباً پانچ فٹ تھا۔ بدن چھریرہ، رنگت سرخ وسپید تھی۔ چہرہ گول خوبصورت ناک اور باریک ہونٹ کے ساتھ بڑے کان اور سر بھی نسبتاً بڑا تھا۔ آخری عمر میں بال

بہت کم رہ گئے تھے۔ نقشی داڑھی جو مونچھوں سے متصل تھی۔ آواز رعب دار اور چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔

وضع اور لباس: نجم آفندی نستعلیق شخصیت تھے۔ وہ مشرقی روایات کے پاسدار اور اسلامی تہذیب کے نمونہ تھے۔ جوش ملیح آبادی نے ساقی جوش نمبر میں لکھا۔ ''حضرت نجم آفندی جو اس قدر دین دار و پابند وضع بزرگ ہیں کہ قہقہہ مارنے کو بھی خلافِ شرع سمجھتے ہیں۔''

نجم آفندی کے لباس میں سادگی تھی۔ وہ عام طور پر سفید شیروانی، سفید پائجامہ، مخمل کی کالی ٹوپی پہنتے تھے۔ کبھی کبھار کالی شیروانی پر شال اوڑھ لیتے تھے۔ پاؤں میں معمولی سلیپر یا جوتا ہوتا۔ ہاتھ میں ہمیشہ چھڑی رکھتے تھے۔ عینک صرف حسبِ ضرورت لگاتے۔

غذا و خوراک: نجم آفندی کم خوراک تھے۔ دیسی گھی اور گڑ سے شدید رغبت تھی۔ ان کی گھی اور گڑ کی چاہت کی کئی داستانیں لوگوں نے بیان کی ہیں۔

سیرت و کردار: ہم نجم آفندی کی سیرت اور عالی کردار کے ساتھ عجز و انکساری کا مختصر خاکہ معز الدین قادری اور ذاکر حسین فاروقی کی تحریروں سے پیش کرتے ہیں۔ اسرار و افکار کے دیباچہ میں معز الدین قادری نے لکھا ہے۔ ''خاندانی روایات مذہبی تعلیم و تربیت اسلام کی عظیم شخصیتوں کے نقوش قدم کو اپنا راستہ بنانے کی سعی و تمنا نے ان کو کافی متوازن، معتدل مزاج اور بنی نوع انسان کا ہمدرد بنا دیا ہے۔ ان کی آنکھوں میں بصیرت کی چمک ہے اور سنجیدگی کے نہ جانے کتنے راز ہیں۔ انھیں بنی نوع انسان سے محبت ہے۔ شخصی اور مذہبی عقائد پر خود سختی کے ساتھ کاربند ہیں لیکن سیرت و کردار میں کہیں بھی ''ملا پن'' یا پندار زہد'' کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا سوانگ موجود نہیں۔ بُردبار، حلیم، خوش خلق اور مصیبتوں میں مسکرانے والی شخصیت ان کے سارے کلام سے جھلکتی ہے اور انھیں یہ کہنے کا حق ہے

میری تلاش راہ پر ہنستے ہیں آج قافلے
شمع بنائی جائے گی کل میری گردِ راہ کی

بقول جوشؔ ملیح آبادی۔ جہاں تک طبائع کا تعلق ہے، باپ بیٹے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک رنگین مزاج شاعر تھے اور ان کو رنگینی کبھی چھو کر نہیں گئی تھی۔ وہ سراپا رند تھے اور یہ سرتا بہ قدم متقی اور خشک قسم کے متقی تھے۔

دبستانِ دبیرؔ میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی بیان کرتے ہیں: ''مروّت وضع داری، ایفائے وعدہ، حُسنِ معاشرت اور بڑے چھوٹوں کے ساتھ یکساں برتاؤ آپ کے کردار کی وہ خوبیاں ہیں جو ہر شخص کے دل میں جگہ پیدا کر لیتی ہیں۔ نجمؔ صاحب نے اپنی زندگی کے جو اصول بنائے تھے وہ تا حیات ان پر کاربند رہے اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے انھوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری اور ان کی کامیاب زندگی ''قابل رشک موت'' کی ضامن بن گئی۔ بقول خود:

کچھ شعر جو منقبت میں کہہ لاتا ہے
اس خواب سے اپنے دل کو بہلاتا ہے
موزوں ترے کردار پہ بھی ہے یہ خطاب
تو شاعرِ اہل بیت کہلاتا ہے

شغل و ملازمت:

1- ریلوے محکمہ میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس وقت نجمؔ کی عمر بیس سال تھی۔
2- پھر دہلی میں ملازمت کی۔
3- کالکا اسٹیشن اور غازی پور اسٹیشن پر کچھ عرصہ ملازم ہوئے۔
4- تحریک ترکِ موالات سے متاثر ہوکر ریلوے کی ملازمت ترک کر دی اور تلاش معاش میں رودولی پہنچے اور کچھ عرصہ کاشتکاری کی۔
5- جونیئر پرنس معظم جاہ شجیع کے دربار سے منسلک ہوئے۔ ان کے سپرد پرنس کے کلام کی اصلاح تھی۔ تنخواہ بھی اس کام کی پاتے تھے۔ نجمؔ کی ماہانہ تنخواہ دوسو روپے ماہوار تھی۔
6- دربار سے علاحدہ ہوکر مالی پریشانیوں میں بسر کی اور اپنی خود داری کو نبھانے اور پیٹ

کی آگ بجھانے کے لیے چھتہ بازار حیدر آباد میں جوتوں کی دکان تک کھولی۔
تف برتو اے چرخِ پیر کہ شاعرِ اہل بیتؑ کو اتنی بڑی قوم تنگ دستی میں سہارا نہ دے سکی جبکہ تمام قوم اور تاجر ان کے کلام سے روحانی اور اقتصادی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اسی لیے تو اپنے خطوط میں اس طرح گلہ کیا "آج ہندوستان میں تبت سے راس کماری تک میرے نوحے پڑھے جا رہے ہیں لیکن مالی فائدہ دوسرے اٹھا رہے ہیں" 'کاروان ماتم' لاہور والوں نے میری اجازت و اطلاع کے بغیر شائع کر لی ہے۔ لکھا تو جواب تک نہیں دیتے۔ یہ قدر دانی ہو رہی ہے۔ ہم تکلیف اٹھا رہے ہیں اور یہ نفع کما رہے ہیں۔"

شاعری کا آغاز: ۱۲ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ ابتدا غزل گوئی سے کی۔ شاہ نیاز وارثی کی غزل پر مصرعے لگائے

زہے عزّو جلالی بو ترابی فخرِ انسانی
علیِ مرتضیٰ مشکل کشائی شیرِ یزدانی

پہلا مشاعرہ: جس مشاعرے سے نجم کی شاعری کا تعارف ہوا وہ خود ان کے گھر کے سامنے منعقد کیا گیا تھا جس میں اکابر شعرا نے شرکت کی تھی۔ نجم کی غزل کا مطلع تھا:

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے
قبرِ عاشق اور ایک میلی سی چادر دیکھتے

شاگردی: شاعری کے آغاز میں اپنے والد بزم آفندی کی شاگردی کی لیکن بہت جلد ہی اصلاح سے بے نیاز ہو گئے۔

صحبت اساتذہ: نجم آفندی کو گھریلو ماحول کے علاوہ اپنے دہلی کے قیام کے دوران نواب سائل دہلوی، بے خود دہلوی، پنڈت امرناتھ ساحر، منشی امیر اللہ تسلیم، شوکت علی میرٹھی، عبدالرؤف عشرت، ناصر علی خاں مچھلی شہری اور وقار کانپوری جیسے شعرا شامل تھے۔ انھیں اساتذہ نے نجم کی شعری صلاحیتوں سے متاثر ہو کر کہیں اس نوجوان شاعر کو صدر مشاعرہ بنایا تو کہیں راجہ پنڈراول نے ان کی شاہکار نظم کو (1800) سو روپیوں

میں خرید کر یہ رقم یتیم خانہ کی خدمت کے لیے وقف کردی۔ کبھی محفل مقاصدہ میں صفی لکھنوی کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ''نجم صاحب ہم نے بائیس(22) سال اس محفل میں چراغ جلایا ہے اب آپ کی باری ہے۔''

خطاب: ناصر الملت نے نجم آفندی کو ''شاعر اہلبیت کا خطاب دیا جو نجم آفندی کے مسلسل سلام اور قصیدہ نگاری کا اثر تھا۔

یہاں یہ بات بھی خارج از محل نہیں کہ نجم آفندی کے دادا کے بھائی مرزا فصیح کو خلافت عثمانیہ کی جانب سے آفندی خطاب کعبتہ اللہ اور حاجیوں کی خدمت کرنے پر دیا گیا تھا جو نسلاً بعد نسل استعمال ہوسکتا تھا۔

ہم عصر شعراء: حالی، اکبر الہ آبادی، اقبال، سائل دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیم، نسیم، حسرت موہانی، صفی لکھنوی، مرزا اوج، دولھا صاحب عروج، مرزا ثاقب، آرزو لکھنوی وغیرہ بزرگ عمر ہم عصر شعرا تھے جب کہ ان کے ہم عمر شعرا میں فانی، جوش، صدق جائسی، یگانہ، سیماب، مہذب لکھنوی، نسیم امروہوی، رئیس امروہوی، سید آل رضا وغیرہ شامل تھے۔

تلامذہ: نجم آفندی کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خود انھوں نے جو فہرست جلیس ترمذی کو روانہ کی تھی اس میں (69) نام تھے۔ وہ بعد میں بڑھ کر (72) ہوگئی، اور کچھ اس طرح ہے جسے ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی نے نجم آفندی فکر و فن میں نقل کیا ہے۔ رعنا اکبر آبادی، جعفر مہدی، رزم رودلوی، صفدر حسین کاظمی، عبد السعید رشک، عابد مرحوم، وزارت علی، علی انجم اکبر آبادی، مرزا عبد الکریم مضطر، کوکب اکبر آبادی، جلیس ترمذی، انتظام الحسینین، خاور نوری، سعید شہیدی، مرزا عادل، ساجد رضوی، شاہد حیدری، عازم رضوی، قائم جعفری، عباس عابدی، خورشید جنیدی، باقر منظور، طاہر عابدی، خواجہ ضمیر، کاوش حیدری، منجو قمر، راحت عزمی، تصور کرت پوری، عباس زاہد، شہید یار جنگ، ہشیار جنگ، ڈاکٹر اختر احمد، تبسم نظامی، طالب رزاقی، حرماں خیر آبادی، عاصم جمیل، ساحر نجمی، سعید السائمہ، زیبا رودلوی، پرنس معظم جاہ شجیع، ہاشم جاں بہادر، اختر زیدی، حسن مدنی، اثر غوری، کاظم رشک، شاغل حیدر آبادی، صمیم

حیدر، محبؔ جاورہ، صادقؔ نقوی، سوزؔ رضا ترمیم، تقیؔ عسکری، اقبالؔ عابدی، سید جعفر حسنین، زاہدؔ رضوی، ظہیرؔ جعفری، آغا ماجرؔ، باذلؔ عباس ضیغم، ساترؔ، ثاقبؔ، سعادتؔ نظر، عبدالحیؔ خاں، شارقؔ، بانوؔ سید پوری، نظیرؔ سیہوری، عقیلؔ نجمی، سہیلؔ آفندی، روپؔ کماری، بیدارؔ نجفی اور وفاؔ ملک پوری وغیرہ۔

ڈاکٹر نواز حسن زیدی لکھتے ہیں کہ تلامذہ کی اصلاح کے وقت نجم آفندی کے ہاں وہی جذبہ کارفرما ہے جسے عشقِ اہل بیت کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ تلامذہ کے کلام کی اصلاح کے لیے با قاعدہ اصول وضع کر رکھے تھے۔ شاگردوں کے خطوط کے جواب میں لکھتے ہیں۔ ''مجھے امید نہیں کہ جلد تمھارا کلام دیکھ کر بھیج سکوں گا۔ از روئے انصاف سلسلہ وار دیکھتا ہوں'' آج کل چار طرف سے پاکستان اور ہندوستان سے اصلاح کا کلام آ رہا ہے۔ سر اٹھانے کی مہلت نہیں۔ دماغ بھی کام دیتا ہے تو ہاتھ کانپتا ہے کس کس کو منع کروں اور کیسے ممکن ہے مدحِ اہل بیت کا مسئلہ ہے۔

مدت مشق سخن: تقریباً ستر (70) سال

مسافرت برائے شاعری: دہلی، کانپور، لکھنؤ، حیدرآباد، کراچی، کلکتہ، بنارس، لاہور ہی نہیں بلکہ دور دراز کے چھوٹے مقامات پر بھی تبلیغ پیامِ اہل بیت میں مشغول رہے۔ چنانچہ فیض آباد، بریلی، بارہ بنکی، سیتا پور، بھرت پور، اجین، مدراس اور بلرام وغیرہ کے لوگ بھی موصوف کے کلام کے دلدادہ رہے۔

زیارت عتبات عالیہ: 1950ء اگست میں زیارتوں کے لئے عراق گئے اور مختلف مقامات مقدسہ پر حاضری دی اور اپنے تاثرات کو منظوم لکھ کر ''تاثرات زیارت'' کے عنوان سے شائع کیا۔

تصنیفات: راقم کو کائنات نجم آفندی مرتب کرتے ہوئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ نجم آفندی کی تصانیف تقریباً عنقا ہیں۔ نجم آفندی کی چالیس (40) سے زیادہ تصانیف شائع ہوئیں۔ سب سے پہلی تصنیف ان کے کلام کا مجموعہ 1917 میں اور آخری تصنیف

''لہوقطرہ قطرہ'' ان کے انتقال کے چار سال بعد 1979ء میں شائع ہوا۔علامہ ضمیر اختر نقوی نے لکھا ہے کہ نجم آفندی نے حیات میں چند تصانیف مرتب کی تھیں مثلاً ''گلدستہ نعت'' ''مذہبی رباعیات'' ''قومی اور مذہبی نظموں کا مجموعہ'' ''خودنوشت سوانح حیات'' جو نامکمل رہ گئی تھی جو کبھی شائع نہ ہوئیں۔نیز نجم کے مضامین کا کوئی مجموعہ بھی ترتیب نہیں دیا گیا۔

نجم مرحوم کی تصانیف کی فہرست جو ضمیر اختر نقوی نے مرتب کی ہے یہاں پیش کی جارہی ہے۔باضافہ چند تصانیف جو بعد میں شائع کی گئی ہیں۔

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.1	پھولوں کا ہار	1917ء	آفندی بک ڈپو، آگرہ	پہلا مجموعہ کلام۔ادبی، اخلاقی قومی نظموں کا مجموعہ وہ نظمیں جو شیعہ کانفرنس میں پڑھی گئی تھیں۔
.2	قصائد نجم	1943ء	آفندی بک ڈپو، آگرہ	رباعیات (32) قصائد اور نظمیں (25)
.3	تہذیب موذت	1943ء	تاج پریس، یوسف آباد، حیدرآباد	رباعیات (140)
.4	اشارات غم حصہ اول	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (32) نوٹے
.5	اشارات غم حصہ دوم	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (33) نوٹے
.6	اشارات غم حصہ سوم	1938ء	احباب پبلشرز، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض (21) نوٹے
.7	کربل کی آہ	———	کتب خانہ اثناعشری، لکھنؤ	جدید نوحہ جات (9) نوٹے
.8	آیات ماتم	1361ھ	نظامی پریس، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض
.9	تصورات غم	1943ء	مکتبہ ناصری کولہ گنج، لکھنؤ	نوحوں کی بیاض

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.10	کربل نگری	1361ھ	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی پر لکھی گئی نظم (اردو۔ ہندی)
.11	اسلام پوتھی	1380ھ	امامیہ مشن لکھنؤ	طویل مثنوی، آغاز اسلام سے ہجرت حبشہ تک (اردو۔ ہندی)
.12	فتح مبین	1943ء	نظامی پریس لکھنؤ	ایک مرثیہ۔ 5 سلام، 9 رباعیات
.13	بیاضِ عجم	1950ء	مکتبہ سلطانی، بمبئی	نوحہ جات، (حصہ اول، 53 نوحے، حصہ دوم 81 نوحے)
.14	شاعرِ اہل بیتؑ جیل میں	1939ء	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	قومی نظموں اور قطعات کا مجموعہ
.15	حسینی سنسار	1364ھ	مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	نوحہ جات
.16	کاروانِ ماتم	———	کتب خانہ اثنا عشری لاہور	(54) نوحے اور سلام
.17	پریم بھکتی	———	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	ہندی نظموں کا مجموعہ، اردو رسم الخط میں
.18	دارالسلام	———	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	جدید رنگ کے سلام
.19	تاثرات زیارت	1950ء	الکٹرک پریس، حیدرآباد	زیارت سے متعلق منظوم خراج عقیدت

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.20	نصاب دینیات	1364ھ	مطبع حیدری، حیدرآباد	بچوں کے لئے مختصر دینی احکامات (نثر)
.21	شہیدوں کی باتیں	1952ء	رضا کار بک ڈپو، لاہور	کربلا والوں کے اقوال اور کارنامے (نثر)
.22	حسینی اور ہندوستان		مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	ہندوستان کا امام حسینی سے روحانی تعلق (نثر)
.23	لغات المذہب	1961ء	رضا کار بک ڈپو، لاہور	ایک ہزار مذہبی الفاظ پر مشتمل لغت (نثر)
.24	چور اماموں	1349ھ	زاویہ ادب، حیدرآباد	بچوں کے لئے مختصر اخلاقی افسانہ (نثر)
.25	چاند کی بیٹی	—	—	—(نثر)
.26	پھول مالا	—	—	—(نثر)
.27	معراجِ فکر	1959ء	رضا کار بک ڈپو، لاہور	مرثیہ
.28	اسرار و افکار	1971ء	ادارۂ قدر ادب، حیدرآباد	چار سو رباعیات و قطعات
.29	قصائد نجم	1372ھ	تاج پریس، حیدرآباد	سولہ (16) قصائد کا مجموعہ
.30	جانِ کربلا	1993ء	مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)
.31	معرکۂ غم		مکتبہ ناصری، گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)
.32	دکھ کا ساگر		مکتبہ ناصری گولہ گنج، لکھنؤ	(نوحے + سلام)

نمبر شمار	نام کتاب	سن طباعت	مطبع	تفصیلات
.33	کاروانِ عزا	———	عزادار بک ڈپو	نوحے اور سلام
.34	ترقی کی برکتیں	———	———	——— (نثر)
.35	قصاید قدسی	———	مطبوعہ شمسی پریس، آگرہ	قصائد
.36	ستارے	1364ھ	دکن اُردو اکادمی	نظموں کا مجموعہ
.37	بندۂ خدا	1969ء	کاظمی پرنٹنگ پریس حیدرآباد	ایک مذہبی ناول (نثر)
.38	نفس اللہ	———	دائرہ الکٹرک پریس، حیدرآباد	——— (نثر)
.39	ترقی پسندوں کے نام	———	———	——— (نثری کتاب)
.40	رباعیاتِ نجم آفندی	———	امامیہ کتب خانہ لاہور	(145) رباعیات
.41	پشتینی قصائد (غیر مطبوعہ)	———	———	قصائد
.42	رباعیات	1976ء	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد	(30) رباعیات
.43	لہو قطرہ قطرہ	فروری 1979ء	پرنٹنگ محل، ناظم آباد کراچی	پچاس منتخب غزلوں کا مجموعہ

وطن پرستی اور انگریز نفرت: سچ تو یہ ہے کہ برصغیر نے علامہ نجم آفندی کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور آزادی کے بعد ع: منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔

وطن دوستی انگریز نفرت اور قومی محبت نجم آفندی کے ریشہ ریشہ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ذیل میں چند واقعات اور حکایات ہمارے دعویٰ کے ثبوت ہیں۔

1. ابتدائی عمر میں جب اسکول میں کسی ہندو لڑکے سے جھگڑا ہونے کے بعد ان کے ہیڈ ماسٹر راج کمار کے جملہ ''تم دونوں مل کر تیسرے کو کیوں نہیں مارتے؟'' نے فوراً

انگریزوں کے خلاف متحد ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ اپنی خودنوشت میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔''میرے دل نے آواز دی کہ تیسرے سے مراد انگریز ہے جس کی غلامی کی صعوبتیں ہم برداشت کررہے ہیں لیکن اس کو مار بھگانے کی جسارت نہیں کرتے۔''

2. نجم آفندی کی کھدر پوشی سے تنگ آکر ان کے انگریز افسر نے ان کا تبادلہ سزا کے طور پر آسنسول کردیا۔ چنانچہ بعد میں نجم نے تحریک ترکِ موالات سے متاثر ہوکر سرکاری ملازمت سے ہمیشہ کے لئے استعفےٰ دے دیا۔

3. انگریزوں کے استعمار سے بیزار ہوکر زمانۂ طالب علمی میں ایک چھوٹی سی انجمن بنائی جس کا خفیہ ایجنڈا انگریزوں سے ان ہی کے ہتھیاروں سے مقابلہ اور قومی ملی یکجہتی تھا۔ اس انجمن کے ممبر ایک خاص قسم کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ انجمن رشتوں کے بھائی کی سازش سے ختم ہوگئی۔

4. سرکاری ملازمت سے علاحدگی کے بعد قومی اور مذہبی رجحان نے تقویت پائی چنانچہ ایک طویل پچیس(25) بند کی نظم ''دُرِ یتیم'' لکھی جو ''پھولوں کا ہار'' مجموعۂ کلام میں شامل ہے اور اس نظم کے ساتھ یہ نوٹ بھی لکھا ہے کہ یہ وہی نظم ہے جس نے شیعہ کانفرنس کے آٹھویں اجلاس منعقدہ الہ آباد میں حشر برپا کردیا تھا اور جس پر رلبہ سید ابوجعفر صاحب نے ساڑھے چار ہزار روپے نچھاور کردیے تھے۔

5. نجم آفندی نے اپنی تصنیف ''ترقی کی برکتیں'' میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے لکھا۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں قوموں کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے طاقت ور بازوؤں کا صحیح مصرف کریں اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے فساد روک کر ملک کی سب سے بڑی خدمت کریں۔

6. نجم آفندی جلیس ترمذی کے خط میں لکھتے ہیں: ہندو قوم کے افراد نے گاندھی جی کو ختم کرکے دنیا کو یہ بتادیا ہے کہ ہندوستانی ذہنیت کہاں تک پست ہوسکتی ہے۔

7. نجم آفندی کانگریسی تھے اور اسی لئے کانگریسی مشاعرے بھی کروائے۔ ایک مشاعرے

میں تو ردیف ''کھدر'' رکھی گئی۔ انگریز دشمنی اور وطن دوستی نے نجم کو کانگریسی بنا دیا۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں۔ ''ہم نے ایسے بھی مشاعرے کئے ہیں جن کا مقصد حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ ایسے مشاعروں کو کانگریسی مشاعروں کا نام دیا جاتا تھا۔ میرے ایک دوست برہم سروپ خار میرٹھی میری طرح پکے کانگریسی تھے۔

8. ترقی کی برکتیں میں لکھتے ہیں: ''ہندوستان کی بدقسمتی سے ہندو مسلم اختلاف پیدا ہوا۔ تضاد بڑھنے لگا اور آج وہ نوبت آئی کہ مسلم لیگ کو پاکستان کی تجویز پیش کرنی پڑی۔

صدمات: 1. سرکاری نوکری سے استعفیٰ کے بعد مالی بحران سے دوچار رہے۔ ماہنامہ ''مشورہ'' جاری کیا لیکن مالی حالت بدتر ہوگئی۔

2. پرنس معظم جاہ کے شاہانہ مزاج کو برداشت نہ کر سکے اور نوکری ترک کردی۔ کچھ دنوں کی فارغ البالی پھر مالی بحران میں تبدیل ہوگئی۔

3. 1953ء میں والد کا انتقال ہوگیا۔

4. 1958ء میں اہلیہ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔

5. برادر خرد کوکب آفندی اور دو بیٹیوں کا پاکستان میں ہمیشہ کے لئے آباد ہونا۔

علالت اور مرض الموت: نجم آفندی کو پرنس معظم جاہ شجیع کی دربارداری نے نیند کی گولیوں کا محتاج کردیا تھا، چنانچہ آخری عمر تک ان زہریلی دواؤں کا اثر باقی رہا۔ اعصاب میں تناؤ کم خوابی، لاغری اور ضعف کے علاوہ آخری عمر کے حصے میں معدہ، جگر، قلب کی بیماریاں اور رعشہ وثقل سماعت سے دوچار رہے۔ آخری عمر جو پاکستان میں گزری عموماً بہت کم باہر نکلتے تھے اور زیادہ تر بستر پر لیٹے رہتے تھے۔

پاکستان میں: 1. نجم آفندی پہلی بار اپریل 1971ء میں بمبئی سے بحری جہاز میں سوار ہوکر کراچی کی بندرگاہ پر اترے۔ کراچی میں چند مہینے قیام کر کے وہ لاہور گئے پھر کراچی آتے جاتے رہے۔ نجم صاحب محافل شعروسخن، مشاعروں مسالموں، مقاصدوں اور مجلسوں میں شرکت فرماتے رہے۔ پاکستان میں تقریباً ہر بڑے اور معروف ادیب،

شاعر اور خطیب سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کا کلام روزناموں، رسالوں، جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں قیام کے دوران بعض اوقات اپنی یادداشتیں ایک ڈائری میں بھی مرتب کیں جو ان کی ملاقاتوں اور محفلوں کی عمدہ یادگاریں ہیں۔

وفات : تاریخ 17/ذی الحجہ 1395 ہجری مطابق 21/دسمبر 1975ء

وقت : ¼ 9 بجے صبح

مقام : کراچی

دن : اتوار

غسل میت : وصیت کے مطابق مکان پر ہوا

نمازمیت : بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں پڑھائی گئی

دفن : سخی حسن دربار کے قبرستان واقع نارتھ ناظم آباد ہوا۔ شفیق اکبرآبادی نے تلقین پڑھائی۔ سوئم کی مجلس رضویہ سوسائٹی کے امام باڑے میں ہوئی۔ سید ضمیر نقوی صاحب نے مجلس پڑھی۔ جنازہ میں صرف پچیس تیس افراد نے شرکت کی۔

قطعات، اشعار اور مصرعہ تاریخِ وفات

1. جناب نسیم امروہوی:

لکھ دو نسیم باکمال قبر پہ سالِ انتقال
بقعۂ پاک محوِ خواب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

1975ء

2. جناب رئیس امروہوی:

فراقِ نجم آفندی مرحوم
''غروب انجم نجم'' اے قلم لکھ

1395ھ

3. جناب فیضؔ بھرت پوری:

رحلت شاعرِ فنا فی اللہ
حجم آفندی اکبر آبادی

1975ء

4. جناب ساحرؔ لکھنوی

سال رحلت کے لئے قبر پہ لکھ دو ساحرؔ
حجم ہے دامنِ مدفن میں ستارے کی طرح

1395ھ

5. جناب کسرتیؔ منہاس:

دُریک دانہ نکتہ داں شاعر

1395ھ

شاعرِ نکتہ داں گرامی تبار

1975ء

6. جناب نیساںؔ اکبرآبادی

تذکرۂ اہلِ بیت جس کا تھا شغلِ سخن
خلد میں وہ آگیا شاعرِ شیریں نوا

1975ء

7. جناب خلشؔ پیر اصحابی:

الف سے الم کے خلشؔ اب تو یوں
ہے لکھا غم حجم دائم رہا

1395ھ = 1394 + 1

8. جناب باقرؔ امانت خوانی:

اس طرح باقرؔ نے کھینچا منظرِ سالِ وفات
اب فلک سے شاعری کے حجم ٹوٹا جلوہ ریز

1975ء

9. پروفیسر فیضی:

بتائید الٰہی یہ شرف فیضی انہی کا تھا
عزادارِ شہید کربلا تھے نجم آفندی

1975ء

10. جناب شائق زیدی:

رہے وہ اے شائق بہ تجمل — شاعرِ اہل بیت جہاں میں
پڑھتے ہوئے آیاتِ ماتم — نجم گئے ہیں باغِ جناں میں

1395ہجری

11. جناب فضل الدین فدا

تعزیت نامہ پاسدار اہل حق

1395ہجری

وفاتِ حسرت آیات جلیل القدر

1975ء

مرجع کرم خسروِ اقلیمِ دانش

1975ء

برگزیدۂ رحمٰن نازش ملّت نجم آفندی اعلی اللہ مقامہ

1975ء

وحید زماں بلند آستاں نور اللہ مرقدہ

1395ہجری

یہ صدمہ کس قدر غم آفریں ہے — نظر بے چین دل اندوہ گیں ہے
فدا لکھ نجم کی تاریخ رحلت — بلا شک ساکنِ خلدِ بریں ہے

1395ہجری

تعداد کل کلام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ

علاّمہ نجمؔ آفندی

نمبر شمار	صنفِ سخن	تعداد	تعداد اشعار
.1	غزلیں	195	1932
.2	رباعیات	591	1182
.3	قطعات	498	1001
.4	نعت	16	304
.5	قصاید	81	2519
.6	سلام	107	1375
.7	مراثی	3 (209 بند)	627
.8	نوحے	144	2237
.9	تاثیر زیارات	10	128
.10	متفرقات	83	1036
.11	ہندی کلام	18	458
کل اشعار = (12799)			

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

''غزل کو میں نے متانت کی آبرو بخشی''

(نجم)

''لہو قطرہ قطرہ'' نجم آفندی کی پچاس غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے جو موصوف کے انتقال کے چار سال بعد پرنٹنگ محل، ناظم آباد کراچی سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے پبلشرز سید محمد شاکر نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ''جہاں تک غزل اور عشقیہ نظموں کا تعلق ہے۔ اس میں بھی آپ کو جو کمال حاصل تھا وہ بھی احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس کے معترف وہی لوگ ہیں جنھوں نے آپ کو ہند و پاک کے مشاعروں میں سنا۔ آپ کے عشقیہ مضامین میں بھی اپنے اندر وہی چاشنی ہے جو ایک حساس دل ہی کا خاصہ ہے۔ آپ کی شاعری میں اگر میرؔ کا نشتر ہے، سوداؔ کی شوخیاں ہیں، انیسؔ جیسی روانی ہے تو غالبؔ کی گہرائی بھی اور انداز بیان نہایت ہی سادہ اور معنویت لئے ہوئے ہے۔''

آنکھوں نے جان ڈال کے دل رکھ دیا تھا نام
دل کیا تھا میرے ذوقِ نظر کا شعور تھا

اگرچہ یہ مجموعہ نجم کے انتقال کے بعد منظر عام پر آیا لیکن خود مرحوم کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کوشش ان کی زندگی میں شروع ہو چکی تھی۔ لکھتے ہیں۔ ''احباب کے مسلسل اصرار کے باعث اکثر مشاعروں میں بھی شرکت کرنی پڑی اور غزلیں کہنا پڑیں مگر اس کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ اس صنف کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔''

ڈاکٹر ثمین فاطمہ غزلوں کے مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں: ''غزل اپنے ارتقائی منازل میں صرف اپنے موضوعات کا مظہر ہیں۔ یہ سوچا بھی نہ جا سکتا تھا کہ غزل کو کسی اور قالب

میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ مرزا غالبؔ نے غزل کے لئے کسی قدر الگ راہ متعین کی تھی لیکن علامہ اقبالؔ نے غزل کو ایک نہایت ترقی یافتہ صنفِ شاعری کی حیثیت عطا کی۔ انھوں نے موضوعات کے تنوع حقائق کی رنگا رنگی کو غزل میں سمو کر یہ بات ثابت کر دی کہ غزل فلسفۂ خودی، فلسفۂ عشق وحسن، مضامین تصوف اور تمام تر مسائلِ حیات کی ترجمانی کر سکتی ہے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ غزل غالبؔ اقبالؔ اور فانیؔ کے بعد صرف تجمّل صاحب کے سہارے ہی سے صدیوں زندہ رہے گی تو بے جا نہ ہوگا۔ تجمّل صاحب کی غزلیں ان اقدار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں جن سے اقبالؔ نے غزل کو آشنا کیا، اس نہج کا آئینہ دار ہیں جس کو انقلابیوں نے پسند کیا۔ ان مسائل کو سموئے ہوئے ہے جو ''ادب برائے زندگی'' کا خاصہ ہیں۔ ان کی غزلوں میں اختصار ہے۔ خیال کی گہرائیاں ہیں۔ فکر کی بلندیاں ہیں۔ ان کے کلام میں اعتماد اور یقین ہے۔'' شاید اسی لئے تجمّل نے کہا تھا:

غمِ حیات کا حاصل تلاش کرتا ہوں　　تبسمِ سرِ منزل تلاش کرتا ہوں
وہ بزم جس میں کچھ اہلِ دماغ بیٹھے ہوں　　میں سادگی سے وہاں دل تلاش کرتا ہوں

اردو کی زندہ ترین روایت جو قدیم ترین بھی ہے، اُردو غزل ہے۔ اُردو غزل نے کئی صدیوں میں عروج وزوال کے منظر دیکھے، نشیب وفراز کے مقامات دیکھے۔ کیوں کہ سخت جان ہونے کے ساتھ جان جاناں تھی اس لئے کبھی بے جان نہ ہوئی بلکہ زندہ رہی اور زندہ دلوں کی ہی نہیں بلکہ افسردہ اور قنوطیوں کے دل کی دھڑکن بھی بنی رہی۔ غزل کی تاریخ اور داستان لمبی ہے، جس کو ہم صَرفِ نظر کرتے ہوئے اُس عدالت کی کچہری میں آتے ہیں جس میں سرسید احمد خان کی سرپرستی میں مشہور غزل گو شاعر غالبؔ کے شاگرد حالیؔ نے غزل پر مقدمہ دائر کر دیا جس کی تفصیل مقدمہ شعر وشاعری میں ثبت ہے۔ اردو غزل کو سخن طعن اور تعریض کا نشانہ بنایا اور اسے عفونت میں سنڈاس سے بدتر بتایا اور فوراً اس میں ترمیم اور تبدیلی پر زور دیا۔ اگر چہ اس استغاثہ کا کوئی خاص اثر اس دور کے حالیؔ کے ہم عصر عظیم شعراء داغؔ، اکبرؔ، امیرؔ، مجروحؔ اور تسلیمؔ وغیرہ پر نہیں پڑا، جنھوں نے اسے نالۂ مرغ چمن غرب سمجھ کر توجہ نہ کی لیکن اقبالؔ، حسرتؔ، فانیؔ، شادؔ، اور تجمّلؔ نے اس کا خاص اثر لیا، بخصوص علامہ اقبالؔ نے اس کو اپنی غزل کا جوہر قرار دیا۔ اقبالؔ کی اولین غزلیں داغؔ کی پیروی میں نظر آتی ہیں جس میں عشق و جذبات کو زبان اور بیان کے

چٹخارے سے خوش ذائقہ بنانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ اقبال کے ذیل اشعار اسی لذت کام دہن سے بھرے ہوئے ہیں۔

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اقبال، لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

لیکن بہت جلد ہی اقبال کا رنگ بدل گیا یہاں تک کہ جن غزلوں کو وہ مستحسن سمجھ رہے تھے۔ اپنے کلام بالِ درا میں جگہ بھی نہ دی اب اقبال حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اقبال کے تینوں اردو مجموعوں میں غزلوں کی تعداد 93 ہے جس میں انلب اشعار پختہ مضامین سے لبریز ہیں۔ یہاں لہجہ نیا ہے جس کے لئے اقبال کو نئی زبان وضع کرنی پڑی، ایسی زبان جو غزل کی زبان سے جدا تھی۔ اگر چہ غالب غزل میں نئے لہجہ کا کامیاب تجربہ کر چکے تھے لیکن اقبال کے لئے یہ نیا چیلنج تھا اور وہ اس میں کامیاب رہے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

غزل کے زندان میں اقبال نے نئے دریچے کھولے لیکن جو لوگ تاریکیوں کے دور کے پالے ہوئے تھے وہ روشنی سے گھبرانے لگے۔ چاروں طرف سے دبے لفظوں میں بغاوت کی

تحریریں رسالوں کے سادہ اوراق کو سیاہ کرنے لگیں۔ فانیؔ، یگانہؔ، سیمابؔ، حسرتؔ، محرومؔ وغیرہ نے اسے شاعری ماننے سے انکار کر دیا۔ میر انیسؔ کے نواسے پیارے صاحب رشیدؔ، اقبالؔ کی غزل۔ ان کے لہجہ اور زبان میں سن کر منہ تکنے لگے کہ یہ کون سی زبان ہے جو غزل میں لگائی گئی ہے۔ اس دور میں نجمؔ آفندی جو اٹھارہ برس کے سن میں عشقیہ مضمون سے بھری وہی لچک دار زبان کی غزل

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے
قبر عاشق اور اک میلی سی چادر دیکھتے

مشاعرہ میں سنا کر داد و تحسین حاصل کر رہے تھے۔ وہی نجمؔ بہت جلد اس راستہ پر گامزن ہو گئے جس پر اقبالؔ نے فکر و خیال کے بلند قامت شجرِ سایہ دار لگائے تھے اور اپنی شناخت کے نقوش بھی چھوڑے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ نجمؔ کے ان اشعار پر اقبالؔ کے کلام کی چھاپ نہیں۔

سبک خرامیِ برق و شرر پیدا کر — جو رہگزار نہ ہو رہگزار پیدا کر
لہو کا جوش دکھا لالہ زار پیدا کر — خزاں کا چیر کے سینہ بہار پیدا کر

کب تک رہیں گے آخر شام و سحر کے شکوے — تو جسے چاہتا ہے شام و سحر بنا لے
پھر دو جہاں بھی تیرے کون و مکاں بھی تیرے — اپنی نظر کو بالکل اپنی نظر بنا لے

فرشتے گرد بھی ان منزلوں کی پا نہیں سکتے — جہاں ہم خاکسارانِ ازل دامن جھٹکتے ہیں

مجھ کو واعظ رشکِ مسجد کی امامت پر ہو کیا — جب نمازِ عشق مقتل میں پڑھا سکتا ہوں میں

کچھ آسماں سے بھی ہے اونچا میرا تخیل — تو زیرِ آسماں کچھ دیوار و در بنا لے

فرشتے رہ گئے خاموش فرطِ حیرت سے — وہ راہِ عشق میں انسان کا مقام آیا

کسی دن نجم کہتا ہے خدائے بندہ پرور سے   تری زلفِ کرم سے لی ہے تابِ سرکشی میں نے

یہ کہاوت کہ ہر مشہور شاعر بڑا نہیں اور ہر بڑا شاعر مشہور نہیں ہوتا، بڑی حد تک صحیح ہے۔ اردو ادب کے تحقیقی مسائل خود اس لئے تحقیق طلب ہیں کہ فن تحقیق عظیم مشکلات سے دو چار ہے۔ تحقیق کی روش اور سطحی تجزیہ اور پھر اس پر یقین کامل محقق کو حق اور حقیقت تک پہنچنے میں مانع ہوتا ہے جس کی مثال خود نجم آفندی کے کلام سے لاعلمی ہے۔ ''کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید'' مطبوعہ ۱۹۹۱ء کے مولف جناب طارق سعید نے غزل کے ارتقا کے عنوان پر مختلف شاعروں کے دور کے غزل گو شعرا کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ اور فراقؔ کے ادوار کے تقریباً دو سو غزل گو شاعروں کے نام فہرست میں شامل کیے ہیں جن میں بعض شعرا مجہول اور معمولی درجے کے ہیں اور اس طویل فہرست میں نجم آفندی مرحوم کا نام ونشان بھی نہیں، جب کہ نجم آفندی کی غزلوں کا مجموعہ ''لہو قطرہ قطرہ'' ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آچکا تھا اور نجم آفندی ہندوستان اور پاکستان میں اپنی غزلیں سنا کر مشاعرے لوٹ چکے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کا منعقدہ یادگاری مشاعرہ جو ۱۹۵۵ء میں لاکھوں افراد نے سنا اور جس کی پوری روداد رسالہ آجکل میں شائع ہوئی، اسے بھی نجم آفندی ہی نے اپنی غزلیں سنا کر لوٹ لیا تھا۔ یہ کوئی چھپی بات نہیں کہ نجم آفندی، فانی بدایونی اور جائسی کے ساتھ نظام دکن کے فرزند شجیع کے دربار میں بیس سال تک غزل کی نوک پلک سنوارتے رہے اور پرنس شجیع کے استاد بھی رہے۔ خود جائسی نے اپنی کتاب دربار دُربار میں تفصیل سے حالات درج کیے ہیں کہ پرنس شجیع صرف نجم اور فانیؔ کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے اور ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اگرچہ ''لہو قطرہ قطرہ'' میں صرف پچاس غزلیں تھیں اور اب اس ''کائنات نجم'' میں ایک سو پچانوے سے زیادہ غزلیں موجود ہیں جو اس بات کی گواہ ہیں کہ نجم کا شمار اردو کے عالی ترین غزل گو شعرا میں ہوتا ہے، اگرچہ زمانہ لاکھ بے اعتنائی کرے، حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔

ڈاکٹر ریاض فاطمہ تشہیر نے اپنی کتاب ''علامہ نجم آفندی کی شخصیت اور فن'' میں بہت سچ کہا ہے کہ ''نجم جیسے شاعر نے جب غزل کے کوچہ میں قدم رکھا تو غزل کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ تبلیغی اور اصلاحی موضوعات میں ایسے گوشے نکالے کہ ان کی روش اختیار کر کے شاعروں کا ایک کاروان بن گیا۔ ان کا مفکرانہ انداز غزل کے سانچے میں ڈھل کے ابدی صداقت بن جاتا

ہے۔ ایک ایسی صداقت جس میں نئی دنیا تعمیر کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ نجم نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انھیں سامراجی شکست و ریخت کا بخوبی اندازہ تھا۔ قدم قدم پر انھیں انسانیت کی پامالی کے منظر بھی بے چین کر دیتے تھے اس لیے ان کے کلام میں ادب و اخلاق، قربانی اور انسان دوستی کا ذکر اکثر جگہ ملتا ہے۔ ان کے اشعار میں درد وغم کی کسک ہے لیکن فانی کی سی قنوطیت نہیں۔ اردو غزل کی تاریخ نے نجم کے ساتھ انصاف نہیں کیا، شاید اس کا سبب یہ رہا کہ رثائی شاعری ان کی ذات سے اس طرح وابستہ اور پیوستہ ہوگئی کہ نجم کے معنی نوحہ وسلام سمجھا جاتا تھا۔

رسالہ ''نگار'' ۱۹۶۵ء جدید شاعری نمبر میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اقبال کی غزل کوئی پر ریویو کرتے ہوئے لکھا ہے: '' اقبال کی غزلوں میں وہ باتیں نہیں ملتیں جو اردو غزل میں بہت مقبول تھیں، مثلاً رشک و رقابت، فراق و وصال، جسم و جمال کا ذکر، صنائع و بدائع اور زبان کی نمائش جن کے بغیر غزل، غزل نہیں سمجھی جاتی تھی اور جن کو ہمارے بیشتر شعرا اپنا اور اپنے کلام کا بڑا امتیاز سمجھتے تھے۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں عام غزل گو شعرا کی طرح نہ زبان رکھی، نہ موضوع، نہ لہجہ، بلکہ ایسی زبان، موضوع اور لہجہ اختیار کیا جن کا غزل سے کوئی ایسا رشتہ نہ تھا، اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تنوع و تاثیر، شیرینی اور شائستگی، نزاکت و نغمگی کے علاوہ جو اچھی غزل کے لوازم ہیں وہ دلبری اور قاہری ملتی ہے۔ اقبال کی غزلوں کے سامنے ہم بے ادب یا بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے۔''

ان نکات کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ نجم آفندی کی غزلوں پر اس عبارت کا حرف حرف منطبق ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ پروفیسر رشید صدیقی نے یہ ریویو اقبال کے کلام پر نہیں بلکہ نجم کی غزلوں پر کیا ہے۔ نجم کی غزلوں کا شمار بیسویں صدی کی ان پاکیزہ غزلوں میں ہوتا ہے جس سے فردوس کی خوشبو آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان غزلوں کو کوثر و تسنیم کے پاکیزہ پانی سے دھوکر صفحۂ قرطاس پر نازل کیا گیا ہے۔ نجم کی غزلوں میں انسان سازی، اقدار عالیہ، کردار سازی، عزت نفس، مساوات، برادری اور اخوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اشعار میں گیرائی کے ساتھ ساتھ فکر و تخیل کی گہرائی موجود ہے۔ نجم حسن بیان سے زیادہ حسن عمل کو اہمیت دیتے ہیں، چنانچہ ان کے

کلام میں واعظ، زاہد، مولوی اور قومی سربراہ اس لیے معتوب ہیں کہ وہ حسن عمل سے خالی ہیں۔

دل میں کر حسنِ عمل سے روشنی اس اندھیرے کا اُجالا اور ہے

انھیں پھیلے ہوئے ہاتھوں کو سرگرمِ عمل کردو اندھیرے میں خط تقدیر پڑھوانے سے کیا ہوگا

یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کے معروف غزل گو شاعر مولانا حسرتؔ موہانی اور حجمؔ آفندی میں بہت سی قدریں مشترک ہیں، اگر چہ مولانا حسرتؔ موہانی، حجمؔ آفندی سے عمر میں بڑے تھے۔ حسرتؔ موہانی کی طرح حجمؔ بھی ایک عاشق مزاج شاعر، ایک دل سوز رہنما، ایک مسلمان جو نماز اور روزہ کا پابند اور ایک حق آگاہ شخصیت تھے۔ حجمؔ، حسرتؔ کی طرح بیک وقت پکے مسلمان کے ساتھ سوشلسٹ بھی تھے۔ وہ حسرتؔ کی طرح کانگریس سے بھی وابستہ تھے اور بڑے صاحبِ کردار و ملنسار شخص تھے۔ جس طرح علامہ سید سلیمان ندوی نے حسرتؔ کو بیسویں صدی کا ابوذر غفاری کہا ہے اس لقب کے حجمؔ بھی حق دار نظر آتے ہیں۔

حجمؔ آفندی نے حسرتؔ کی طرح حکومت برطانیہ اور انگریزوں کے خلاف مہم چلائی۔ جیسا کہ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں کہ جب کسی ہندو لڑکے سے جھگڑا ہوا اور سکول کے ہیڈ ماسٹر رام چندر نے کہا کہ تم دونوں مل کر تیسرے کو کیوں نہیں مارتے، اس جملہ کا اثر بارود کے ڈھیر میں چنگاری سا ہوا اور پھر ساری عمر، انگریزوں کے ظلم و جور کے خلاف احتجاج کرنے میں صرف کردی۔ چنانچہ انہی دنوں ایک خفیہ انجمن بھی بنائی تھی جو انگریزوں کے خلاف بغاوتی منصوبے تیار کرتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ حسرتؔ کی طرح حجمؔ بھی کھدر پوش تھے اور اس کھدر پوشی سے بدظن ہوکر جب حجمؔ کے انگریز عہدہ دار نے ان کا تبادلہ دہلی سے کسی معمولی دور دراز مقام پر کردیا تو حجمؔ نے انگریز کی نوکری سے استعفیٰ پیش کردیا۔

حجمؔ حسرتؔ کی طرح انگریز کو حاکم نہیں بلکہ غاصب سمجھتے تھے اور حسرتؔ کی طرح حجمؔ کو بھی جیل کی مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ صرف فرق اتنا تھا کہ حسرتؔ کو بامشقت قید ہوئی اور حجمؔ کو بغیر مشقت کے۔ حجمؔ کی جیل میں لکھی نظموں، رباعیوں اور قطعات کے مجموعہ کو ''شاعر اہل بیٹ جیل میں'' عنوان سے ۱۹۳۸ء میں شائع بھی کیا گیا۔

حسرتؔ موہانی نے جیل میں کہا تھا:

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک گونہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

تجمّل نے جیل سے آواز دی تھی:

دلِ شاعر تمنا بن گیا ہے سرفروشی کا
تمنّا کس کو کہتے ہیں تمنّا دیکھنے آؤ
سلاخوں ہی سے آکر جھانک لو ہم دردمندوں کو
تماشا بن نہیں سکتے تماشا دیکھنے آؤ

حسرتؔ کی طرح تجمّل نے بھی غزل کے لہجہ میں غمِ روزگار اور سیاسی مطالب کو پیش کیا۔ ''شاعرِ اہلِ بیتؑ جیل میں'' کتابچہ میں شامل دو غزلوں کے چند اشعار اس کامیاب روش کے گواہ ہیں۔

جنھیں تم نے خلافِ وقت سمجھا بے محل جانا — انھیں آہوں سے ممکن ہے ہوا کا رُخ بدل جانا
خدا کی شان اُن کو سلح کی کرنی پڑیں باتیں — بہت دشوار نکلا میرا باتوں میں بہل جانا
جنابِ تجمّل ہیں مسند نشیں کچھ دن سے زنداں میں — تقاضائے ادب ہے جانے والے سر کے بل جانا

ارادہ جب اٹل ہے انقلاب آنے سے کیا ہوگا — نہ بدلے گا یہ دل دنیا بدل جانے سے کیا ہوگا
بحمد اللہ محفل کی فضا میں نے بدل ڈالی — اٹھا دو اب مجھے اب میرے اٹھ جانے سے کیا ہوگا
نگاہِ خشم گیں دعوت نہ بن جائے تبسم کی — ہم ایسے منچلوں پر آگ برسانے سے کیا ہوگا

اِسے سہلِ انگاری نہ کہیں تو کیا کہیں کہ اس عظیم اردو ادب میں آج تک کوئی جامع کتاب سہلِ ممتنع پر موجود نہیں۔ مختلف کتابوں میں چند اشعار سہلِ ممتنع پر ملتے ہیں لیکن اس عظیم شعر پر جو آسان طرزِ بیان میں عمدہ مضمون کی عکاسی کرتا ہے۔ مطالب موجود نہیں۔ اردو کے دو بڑے شاعر غالبؔ اور انیسؔ کے درمیان اسی موضوع پر چشمک آرائی ہوئی۔ میر انیسؔ نے کہا تھا:

ہے سہلِ ممتنع وہ کلام ادق مرا
برسوں پڑھیں تو یاد نہ ہووے سبق مرا

اس شعر کو غالبؔ نے مہمل کہا اور بتایا کہ سہل کا تضاد ادق ہے اور یہ ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں میر انیسؔ حق بجانب ہیں۔ سہل اور ادق عربی کے سہ حروفی لفظ ہیں۔ ادق کے معنی باریک اور دقیق بھی ہیں چنانچہ میر انیسؔ فرمارہے ہیں میرا وہ کلام جو باریک اور دقّت طلب ہے، وہ میں نے سہل لفظوں میں یوں باندھا ہے کہ دوسرے اس کو باندھ نہیں سکتے۔ ہر بڑے شاعر کے کلام میں سہل ممتنع کے اشعار ملتے ہیں۔ حجمؔ کے کچھ شعر دیکھئے۔

حجمؔ کیا روکے گی یہ دنیا مجھے میں نکل جاؤں گا ٹھکراتا ہوا

اب اتنی تو ہمت کیے جایئے اجل آئے تک ہی جیے جایئے

خاک کے پتلوں پر ہنستی ہے زمیں آسماں تک سر اٹھا کر رہ گئے

اپنے اپنے بنالئے ہیں خدا ہر پرستش میں خود پرستی ہے

مسخ ہوتے ہیں ارادے بارہا کوئی شاید کار فرما اور ہے
(حضرت علیؑ کے قول کی عکاسی ہے)

حجمؔ دنیا میں بہت سے کام ہیں آدمی درکار ہے جن کے لئے

رحمت کا اعتبار بھی جاتا ہے ہاتھ سے اب کرچکے گناہ تو پروا نہ کیجئے

نہ کس طرح تری رحمت کا آسرا کرتے اگر گناہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے

وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے

دنیا سے لگا تھا دل تو بہت اٹھنا ہی پڑا محفل ہی تو ہے

حجم آفندی نے کہا تھا: ع : دردِ دل کہہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں:

چنانچہ اس دردِ دل نے حجم سے خوبصورت غزلیں کہلوائیں جس میں اخلاق و کردار کی تعلیم، عزت نفس کی اہمیت، عظمت انسان، معاملات عشق، تصوف، غم جاناں کم اور غم دوراں زیادہ کی عکاسی ہے۔ ان مضامین کے ساتھ ساتھ مختلف اصنافِ سخن کے مطالب بھی اس میں رچے ہوئے ہیں۔غزل کی ردیف میں حجم کے چند شعر دیکھئے:

فلسفہ، منطق، سیاست، موعظہ، حکمت حدیث علم و فن کی ہر بلندی پر نظر آئی غزل

حمد و نعت و منقبت نوحہ قصیدہ، مرثیہ کتنے عالم اپنے دامن میں اُٹھا لائی غزل

میرؔ و غالبؔ کی غزل حجم اور ثاقبؔ کی غزل تجھ سے ارض تاج نے کی بزم آرائی غزل

زادیۂ ایراں ہے تو پروردۂ ہندوستاں یہ دو عالم مانتے ہیں تیری یکتائی غزل

حجم میرے ہم وطن ہیں غالبؔ و میرؔ و نظیرؔ کیوں نہ کرتی میرے در پہ ناسیہ سائی غزل

میرؔ حق میر عشق کے امام ہیں۔ اقبالؔ نے بھی عشق ہی کو سرمایۂ حیات کہا ہے اور عقل کو اس کے مقابل خام اور کمتر بتایا ہے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

حجم آفندی بھی عشق کے عاشق ہیں اور اسے زندگی جاودانہ کا نسخہ بتاتے ہیں۔ یہ عشق بازاری اور کوٹھے کا عشق کا نہیں، یہ وہ چوما چاٹی کی چٹخارنہیں جس سے شعرا کے شعری صفرے بھرے پڑے ہیں بلکہ یہ پاکیزہ مضمون عشق کی قوت اور عشق کی عظمت کا نقیب ہے۔

میں عشق کے تصدق انسان بن گیا ہوں زیرِ قدم فرشتے آنکھیں بچھا رہے ہیں

فطرت عشق جو دے ساتھ تو آسکتا ہے ساری دنیا کے مقابل تنِ تنہا کوئی

طاقتیں مسلّم ہیں علم و عقل کی لیکن عشق کو تعلق کیا ان پناہ گاہوں سے

عشق ایثار کا وہ نقطۂ آخر ہے جہاں　　زندگی میں ہے فراقِ تن و جاں ہوجانا

جہانِ عشق میں جس کو کبھی زوال نہ ہو　　کمالِ غم سے وہ نصف النہار پیدا کر

نجم صاحب کو راستہ دینا　　مذہب عشق کے امام آئے

خدا کو میں نے بہ فیضانِ عشق مان لیا　　خرد زدوں کو دلائل میں سر کھپانا تھا

کہیں خود بھی بدلتا ہے زمانہ　　زبردستی اگر بدلا نہ جائے

اخلاق و کردار سے نمو پانے والی قدر کو عزتِ نفس بھی کہتے ہیں۔ یہ خودداری قناعت توکل اور خودی کی خورکھتی ہے۔ یہ غرور نہیں، تکبر و نخوت نہیں، بلکہ ہر انسان کا حق ہے۔ شاہ و گدا، امیر و غریب، مزدور و منعم، آقا اور غلام سب عزتِ نفس کے حق دار ہیں۔ یہ پیام بڑی شاعری میں نظر آتا ہے۔ نجم جیسا شاعر ان اشعار میں اپنی خودی کا متعارف ہی نہیں، بلکہ دوسرے افراد کی عزتِ نفس کا طلب گار بھی ہے۔

نہ محبت کے نہ دولت کے طلب گار ہیں ہم　　کم سے کم عزتِ انساں کے تو حق دار ہیں ہم
ہر فضا میں ہمیں رہنا ہے نمایاں ہوکر　　آج سردار نہیں ہیں تو سرِ دار ہیں ہم
دوش پر ہم نے اٹھا رکھا ہے کونین کا بار　　کون کہتا ہے زمانے کے لئے بار ہیں ہم

اک مشت خاک ہی سہی نسبت تو دیکھئے　　کونین میں مقامِ بشر ہے خدا کے بعد

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی　　کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

نجم کیا روکے گی یہ دنیا مجھے　　میں نکل جاؤں گا ٹھکراتا ہوا

جہاں تک عزت نفس اور شاعر کے جذبات سے مخلوط فخر و مباہات کا سوال ہے، وہاں نجم تعلّی میں منفرد ہیں۔ حسب، نسب، کسب، مذہب، وطن، قوم، زبان، اور فکر و خیال پر مطمئن ہی نہیں بلکہ مشکور بھی ہیں۔ طوالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعلّی کے چند شعر یہاں درج ہیں:

نجم فطرت ہے مری ولولۂ شعر و ادب — میرے ایک ایک نفس میں ہے غزل خواں کوئی

اے نجم کتنے اہلِ سخن نے میرے سخن کے چربے اُتارے

نجم مغرب کی فضا بھی کانپ جاتی ہے کبھی — گوشۂ مشرق سے وہ پیغام پہنچاتا ہوں میں

بہت بلند ہے ہستی مری مگر اے نجم — میں اک ذرّہ ہوں ناسخ کے آستانہ کا

پچپن برس کے ملک سخن پر تصرفات — تیری ثنا گری ہے مرے گھر کی کائنات

زمینِ سخن آسماں بن گئی ہے — وہ گردوں سے اے نجم تارے اُتارے

نجم کے سخن میں اب درد ہے قیامت کا — پہلے لعل اُگاتا تھا خون اب اگلتا ہے

نجم یہ خندہ جبینی ہر بلائے عشق پر — کس تبسم کا خزانہ مرے آب و گل میں ہے

سوتے سوتے جاگ اٹھی کیفیتِ شعر و سخن — جس کسی محفل میں پہنچے نجم ہم ہی ہم رہے

کریں گے نجم کیا اردو کے دشمن قدر اردو کی — جو پشتیٔ سپاہی ہو وہ لشکر کی زباں سمجھے

میں نجم خود ہی سراپا نیاز ہوں ورنہ مرے کمال کی چوکھٹ پہ سر جھکا کرتے

فضل خالق سے مرے افکار میں اشعار میں فلسفہ ہے نجم غالبؔ کا زبانِ میرؔ ہے

نجم کو اردو سے بڑی محبت ہے۔ اردو ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ چار پشتوں سے مدح محمدؐ و آل محمدؐ اسی زبان میں، اس خانوادے کا منصب رہی ہے۔ شاعری کے زیر و بم نجم کے استخوان بندی میں شامل ہیں۔ دل سے نکلے ہوئے اشعار اردو کے حق میں ملاحظہ کیجئے:

زبان شاعر کامل پہ ہو اگر اے نجم میری نظر میں تعلّی کوئی گناہ نہیں

آج اردوئے معلّی کی اشاعت کے لئے یہ غنیمت ہے کہ نجم نکتہ داں باقی رہا

یہ بھی اک حادثہ اردو کی محبت کا ہے نجم کُنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

میں خود ہوں مطمئن اے نجم ادب کی خدمت سے جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

زباں دانِ محبت ہی نہیں تم تمھیں کیا قدر ہو اردو زباں کی

ہم نے منزلت دی ہے نجم نظم اردو کو ہر زمینِ شعر پر ہم نے آسماں اتارا ہے

میں پھیلاتا ہوں نور اے نجم اپنے کنجِ عزلت سے زمینِ شعر میرے دم قدم سے آسمانی ہے

اردو میں ہے نجم مری نغمہ سرائی نغمہ عجمی اور نہ لہجہ عربی ہے

اعلان غربت کا اب اردو زباں سے ہے پوچھے تو کوئی یہ ادب یہ لہجہ کہاں سے ہے

اردو شاعری کا گھسٹا پٹا مضمون بے وفائی ہے۔ حجم کے ہاں یہ مضمون غم جاناں سے زیادہ غم دوراں میں نظر آتا ہے۔ حجم کی بلند شخصیت اور کمال فن کے حاسدوں نے ان کی زندگی دوبھر کر دی تھی۔ خودداری اور قناعت، طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چاپلوسی، خوشامد اور حکمراں نوازی سے نفرت تھی۔ چنانچہ دشمن بہت آسانی کے ساتھ نقصان پہنچا دیتے تھے۔ حجم آفندی اردو ادب کے شاید وہ تنہا شاعر ہیں جو بیس سال سے زیادہ دربار سے منسلک رہے، لیکن کبھی تعریف اور مدح نہ کی۔ حجم کے پاس ایک شعر بھی کسی حکمراں کی شان میں نہیں ملے گا۔

مارا ہے کس کے داؤں نے دنیا سے کیا کہوں میں دوست سے قریب تھا دشمن سے دور تھا

کہاں وہ عہد گذشتہ کی دوستی اے دوست وہ دشمنی کی شرافت وہ دوستی نہ رہی

باطن میں مرا دوست ہے ظاہر میں ہے دشمن کہہ دے جو مرے عیب مرے سامنے آ کے

مصیبت پر میری خوش ہونے والے بھی ہیں دنیا میں بُرا کیا ہے مرا غم دشمنوں کے کام آتا ہے

میں فکرِ خیر میں ہوں وہ شر کر چکا بہت دشمن بچے گا اب نہ مرے انتقام سے

بہت ممنون ہوں احباب کی چشم عنایت کا مری کمزوریاں دیکھیں نظر اپنی طرف کم کی

دشمنی مرا کیا بگاڑے گی دوست بن کر مجھے تباہ کریں

جو دوستوں پہ بھی چھپ کے وار کرتے ہیں بھلا وہ کیا کسی دشمن کا سامنا کرتے

اس تحریر کے اختتام پر ہم مختلف منتخب غزل کے اشعار جو مقصدِ زیست، آمیزش دین و دنیا، واعظ، خطیب اور مولوی حضرات کے ریاکارانہ رویہ سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں، جن کا مقصد

آگہی اور انسانی اقدار کو نمایاں کرنا ہے، یہاں نمونتاً پیش کئے جا رہے ہیں:

عمر بھر پرورشِ فکر و نظر ہوتی ہے　　زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

عیش کیا سخت سزا دیتا ہے　　مقصدِ زیست بھلا دیتا ہے

بزم انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل　　ایک ذرّہ نہیں محفوظ ادا کاری سے

میرے لئے آرام کہاں　　مسجد کا امام ہوں نہ منبر کا خطیب

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا　　تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور
ہر جادۂ منزل میں ہے سجدے کی ادا اور　　معبد کی فضا اور ہے مقتل کی فضا اور

زہے جلال کے شاہوں کو دستِ قدرت نے　　کیا لحاظ نہ ہم صورتِ گدا کرتے

تیز گامی پر نہ جا اے رہنمائے کارواں　　ایسے کتنے کارواں آگے بڑھے اور تھم رہے

بہت بڑا مجھے کرنا ہے اک سفر اے دوست　　اسی کے واسطے سامان آج تک نہ ہوا

یہ خیال خام ہے کس کم نظر کج فہم کا　　مسندِ شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

رحمت نے گنہگاروں کو خود حشر میں ڈھونڈا　　واعظ نے مجھے مار ہی ڈالا تھا ڈرا کے

رحم کے قابل ہے اس کا عالمِ بے چارگی　　کہہ دیا جس نے بہت کچھ اور سوچا کچھ نہ تھا

عجب کیا شرک کا الزام آئے میرے سجدے پر
محبت دل میں ہے اے نجم اک انسان اعظم کی

اٹھا کر دہر سے رسمِ محبت اہل دنیا نے
اضافہ علم و حکمت میں کیا انسانیت کم کی

کس کو خبر مرحلے طے کتنے کیے ہیں
اک قطرۂ ناچیز نے تعمیر گہر تک

یہ گت بنا کے جاؤں میں کیا اُس کے سامنے
تخلیقِ کائنات پہ جس کو غرور تھا

اے نجم میں پتلا ہوں رنگ اور تلون کا
کس رنگ میں لکھے گی دنیا مرا افسانہ

نجم یہ خندہ جبینی ہر بلائے عشق پر
کس تبسم کا خزانہ میرے آب وگل میں ہے

ہر ایک در پہ نہ جا نجم داد کی خاطر
کمالِ شعر و سخن کو گدا گری نہ بنا

نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے
نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہوکر

دیکھ اے واعظ مرا عرش سخن
میں ترے منبر پہ جاکر کیا کروں

واعظ کو مبارک درِ توبہ کا سہارا
یارب مجھے دنیا سے گناہگار اٹھالے

ہماری فکر کا اندازہ دیکھ کر اے نجم
فلک سے کیا یہ غزل کی زمیں اتر آئی

نجم بہتر ہے تصنّع کی دل آویزی سے
تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

میں فرشِ میکدہ پہ بھی ہوں مثلِ بوئے گل　　واعظ غریب مسند و منبر پہ بار ہے

کچھ ایسے خاک نشیں اہلِ دل بھی گزرے ہیں　　اجل بھی آئی سرہانے تو پوچھ کر آئی

ترتیبِ عناصر میں فرق آ ہی گیا اک دن　　آخر یہ قفس رہتا کب تک مرا کاشانہ

ہم نے دیکھے ہیں یہ منظر زندگی کی دوڑ میں　　جو زیادہ سے زیادہ تھے وہ کم سے کم رہے

کسی دن جا ملے گی روح ایک دن حقیقت میں　　کہاں تک واسطہ اے جمؔ آب و گل کے زنداں سے

اے جمؔ مدحِ آلِ نبی میں گزار دوں　　اللہ عمرِ خضر جو مجھ کو عطا کرے

میں جمؔ نہیں واقف آسائشِ دنیا سے　　کچھ نوحہ و ماتم ہی نکلیں گے مرے گھر سے

جمؔ ہم نکلے جو ارضِ تاج سے　　خسروِ بے تاج ہوکر رہ گئے

جمؔ اربابِ غرض نے دل کے ٹکڑے کردیے　　زندگی نعمت سہی نعمت سے بھی دل بھر گیا

میں جمؔ خود ہی سراپا نیاز ہوں ورنہ　　مرے کمال کی چوکھٹ پہ سر جھکا کرتے

راس آئے جناب جمؔ تمھیں　　سالکِ جادۂ وفا ہوتا

میرزا جمؔ سے نہ کچھ کہنا　　چاہے جو کچھ یہ کج کلاہ کریں

مہر و مہ بھی ہیں نجم دنیا میں   آدمی سے مگر یہ بستی ہے

میں غالبؔ و ناسخؔ کا ہم آواز ہوں اے نجم   بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں ہے

نجم یہ نشانی ہے اہلِ دل کی دنیا میں   ہم کو خاص نسبت ہے غم کی بارگاہوں سے

شاعر سمجھ کے نجم کو سمجھے ہیں سادہ دل   واقف نہیں ہیں آپ بھی اس کج کلاہ سے

نجم میں قائل نہیں ہوں انکسار و عجز کا   میں ہوں سلطانِ سخن اور فکر برحق ہے ندیم

ہم نجم چار روز کے مہمان ہیں مگر   رہ جائیں گے یہ شعر و ادب کے تبرکات

اختر انصاری اکبرآبادی

آسمانِ شعر و ادب کے نجم

جناب باقر زیدی کا ارشاد ہے کہ یادوں کے دریچوں کو وا کرو، بھولی بسری باتوں کو دُہراؤ۔ ریگزارِ سندھ میں رہتے ہوئے بھی ارضِ تاج کو تصورات کی دنیا میں لاؤ اور پھر یہی نہیں ارضِ تاج سے ارضِ دکن پر کمند ڈالو اس لیے کہ جناب ابنِ بزمؔ جناب نجمؔ کا مولد اکبرآباد تھا اور مسکن دکن، جناب بزمؔ نے ترکِ وطن کر کے دکن میں محفل جمائی تھی، بیٹا باپ سے کیسے جُدا رہتا۔ جناب نجمؔ کو بھی سرزمینِ تاج چھوڑ کر دکن جانا پڑا۔ ان کو وطن چھوڑنا پڑا اور اپنے میاں نظیرؔ نے وطن پر اشرفیوں کی تھیلیاں قربان کر دیں، اس لیے کہ شاہوں کے دربار میں سب کچھ تھا مگر وہ تاج محل نہیں تھا جس کا مینارہ صبح کو دیکھنے کے بعد میاں نظیرؔ شام تک شاداں و فرحاں رہتے تھے، دَور دَور کی بات ہے، زمانے میں تغیرات آتے رہتے ہیں۔ زمین بھی گردش میں رہتی ہے۔ کبھی کبھی راستے بھی بدل دیتی ہے۔ میاں نظیرؔ بھی آج زندہ ہوتے تو نہ معلوم اُن پر کیا گزرتی، کہاں جاتے کہاں رہتے کہ زمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔

''یادیں'' تو پرچھائیاں بن چکی ہیں۔ ان میں تسلسل قائم نہیں رہا۔ تسلسل قائم بھی کیسے رہتا۔ ملکوں کے نام بدل چکے ہیں، ہندوستان اور پاکستان۔ ہم پاکستان میں ہیں اور ارضِ تاج، ہندوستان میں۔ تاج محل کی ٹھنڈی نقلی چاندنی کی یاد بھی اب دھندلا گئی ہے۔ پھر یادوں کو مربوط رکھنے کے لیے دماغ اور جسم کی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اب کہاں، نہ وہ دماغ نہ وہ صحت۔ میں شاعرِ انقلاب حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی کے دماغ و دل کی توانائی کہاں سے لاؤں، ''چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔'' جوشؔ تو ہماری اُس کھوئی ہوئی عظمت کا روشن مینار ہیں جس

سے ہم اہلِ قلم پہچانے جاتے ہیں۔ جوشؔ صاحب کے حافظۂ صحت کا یہ عالم کہ سب کچھ یاد اور سب کچھ یادوں کی برات میں محفوظ۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ بھی قلم بند کر دیا جائے تو بات آگے بڑھانے میں آسانی ہوگی۔ جوشؔ صاحب کے والدِ بزرگوار بھی شاعر تھے۔

جوشؔ صاحب خود نوعمری سے ہی مشغلۂ شعر فرماتے تھے۔ مگر والد صاحب پر یہ انکشاف اس وقت ہوا جب ایک مشاعرے میں ''سامنا'' ہوگیا۔ جوشؔ صاحب کی عمر اس وقت یہی پندرہ سولہ کا سن ہوگی۔ جوشؔ صاحب کو مشاعرے میں خوب داد ملی اور والد صاحب کو مقابلتاً بہت کم۔ آخر خانصاحب ٹھہرے۔ مشاعرے کے بعد گھر پہنچنے پر صحن میں غیظ وغضب کے عالم میں ٹہل رہے تھے کہ جوشؔ صاحب دبے پاؤں گھر میں داخل ہوئے۔ ایک کڑکتی ہوئی آواز آئی۔

''شبیر خاں ادھر آؤ، سنو! آج سے تمہاری شاعری بند، ہم اپنی توہین گوارا نہیں کر سکتے۔''

کسی مشاعرے کی کیفیت کا سراغ تو نہیں ملا مگر اندازہ یہی ہے کہ بزمؔ اور نجمؔ جب بھی کسی محفلِ مشاعرہ کی رونق ہوتے ہوں گے تو سامعین کی توجہ کا مرکز نجمؔ ہی بنے ہوں گے۔ حضرت بزمؔ آفندی کی قادرُ الکلامی برحق، مگر اسی دور میں نوحؔ ناروی اور یاسؔ یگانہ بھی تھے۔ جناب نوحؔ فراموش کر دیے گئے مگر یگانہؔ آج بھی موضوعِ گفتگو ہیں۔ بات تو یہ ہے کہ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ، شگفتہ بیانی کچھ اور کہتی ہے اور قادر الکلامی کچھ اور۔ نجمؔ آفندی کے دل کا گداز، شگفتہ بیانی کا مظہر تھا، اور منفرد اندازِ بیان، سونے پہ سہاگہ۔

کم وبیش ۳۵، ۳۶ سال کی بات ہے اور وہ بھی اکبرآباد کی۔ رعناؔ اکبرآبادی سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ جب بھی میں تاج گنج سے شہر آتا تو حضرت رعناؔ وصباؔ سے ملاقات ضروری سمجھتا۔ ملاقات اور تجدید ملاقات کے مواقع نکلتے ہی رہتے تھے۔ ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میں رعناؔ صاحب سے ملنے گیا۔ بیٹھک کا دروازہ وا تھا، رعناؔ صاحب دروازے کے سامنے ہی بیٹھے تھے۔ اچانک رعناؔ صاحب کھڑے ہو گئے اور کہا نجمؔ صاحب سامنے سے آرہے ہیں، میں نے کہا نجمؔ صاحب یہاں کہاں، وہ تو دکن میں محفل جمائے ہوئے ہیں۔

یہ فقرہ مکمل ہو رہا تھا کہ السلام علیکم، وعلیکم السلام سے کمرہ گونج اُٹھا۔ نجمؔ صاحب کی آواز خاصی بھاری بھرکم تھی، تعارف ہوا، پہلا تعارف۔ دکن سے وطن آمد کی وجہ معلوم ہوئی کہ آج کمپنی

پارک میں مجلس ہے۔ نجم صاحب کو مرثیہ پڑھنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور نسیم امروہوی بھی آئے ہوئے ہیں۔ نسیم صاحب کے مرثیے تو سُنے تھے، مگر نجم صاحب کا مرثیہ سننا تو درکنار دیکھا بھی پہلی بار تھا، دل نے کہا آج کربلا والوں کی محفل میں ضرور جاؤ اور نسیم و نجم کا طمطراق دیکھو۔ مرثیہ لکھنا آسان کام تو نہیں ہے۔ لکھنے والا خود تصویرِ درد بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہم کشان کشاں پہنچے، اور گریاں گریاں واپس آئے۔ مرثیہ لکھنا تو مشکل ہے ہی مگر پڑھنا اور بھی زیادہ کارے دارد۔

سچی بات کہتے ڈر لگتا ہے۔ نسیم امروہوی کچھ اس انداز میں مرثیہ سُنا رہے تھے جیسے کوئی واقعات اور سانحات بیان کر رہا ہو۔ لہجہ بھی ویسا ہی تھا۔ جیسا مرثیہ۔ مگر حضرت نجم کے تیور ہی اور تھے۔ وہ مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ لوگ سر دُھن رہے تھے۔ جیسے یہ واقعہ آج ہوا ہے۔ مرثیے میں درد تھا۔ کرب تھا اور وہ خود تصویرِ درد۔ باتیں پرانی۔ انداز نیا۔ پھر بیان سبحان اللہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نجم صاحب کے مرثیے کا اثر میں کئی دن تک محسوس کرتا رہا۔ کلام اور بیان کی یہ تاثیر کسی کسی کو ملتی ہے۔

جناب نجم سے پہلی ملاقات کے بعد وقفے وقفے سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ گفتگو بھی سُنی، کلام بھی۔ پڑھنے اور سُنانے میں خود اعتمادی کے تیوروں نے لطف دیا۔ یہ اعتماد ذات کا اعتماد ہی نہ تھا بلکہ فن کا اعتماد بھی تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اعتمادِ ذات کے جوہر جب ہی کھلتے ہیں جب شاعر علم و فن کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔

نجم آفندی نے مرثیے بھی لکھے۔ غزلیں بھی کہیں، نظمیں بھی تصنیف کیں اور تضمین کے فن کو بھی آزمایا۔ اُن کی زنبیلِ شاعری میں سب کچھ تھا۔ ہر صنفِ شعر پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ الفاظ کا ذخیرہ بھی اتنا کہ جتنا خرچ کیجیے، بڑھتا ہی جائے۔ علم و آگہی کا یہ عالم کہ بیدار دماغی تحسین و آفریں کہے۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ قیامت ہوتے تھے۔ بلا ہوتے تھے۔ کسی گھر بند نہیں، بلکہ ہر دروا۔

وقت جیسے جیسے گزرتا جاتا ہے، ادب و شعر کی شاخیں پھیلتی جاتی ہیں۔ عصرِ حاضر میں شاعر کے افکار کے جائزے سے پہلے نظریۂ شعر کی بات ہوتی ہے۔ پہلے اسکول تھے۔ دبستان تھے۔ انھیں سے شاعر پہچانا جاتا تھا۔ اب نظریات کی بات ہوتی ہے۔ عِم جاناں، عِم دوراں کے علیحدہ

علیحدہ تذکرے ہوتے ہیں۔علیحدہ علیحدہ کسوٹیاں وضع کی جاتی ہیں ۔ پہلے وطن اور قوم کی ترجمانی کا تصور سب سے اہم تھا۔قوم وملّت کی اصلاح کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اگر اقبالؔ علمی قد کی بلندی کے ساتھ نہ آتے تو شاید فرسودہ خیال کہلاتے ۔حالؔی اور اکبرؔ بڑا کام کر گئے مگر نظریات کے اسیر انہیں کہاں مانتے ہیں،نظریات تو مغرب سے آئے ہیں ۔ان نظریاتی مبلغین کے سامنے وہ مقصدیت کہاں جس کی مسلم قوم کو ضرورت ہے۔ جناب نجمؔ کی متعدد نظموں کی روشنی میں یہ فیصلہ غیر حقیقی نہیں ہوگا کہ وہ مزاجاً حالؔی اور اقبالؔ سے قریب ہیں اور ان کے یہاں ملک وملّت اور وطن اور قوم کا واضح تصور ہے۔ وہ شاعری کے ذریعہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں،کوئی خدمت کرنا چاہتے ہیں ۔ایسی خدمت جوعظمت کی ضامن ہو۔

نجم صاحب کا تمام کلام سامنے نہیں ہے اور اگر جملہ ذخیرۂ شعر وادب پیش نظر بھی ہوتا تو حادثاتِ ارضی وسماوی سے عصرِ حاضر میں آدمی کو اتنی مہلت کہاں کہ سب کچھ پڑھے لکھے۔ نیرنگیِ زمانہ کا بُرا ہو۔ حالات ایک حساس شاعر کو بیقرار رکھتے ہیں۔ وہ کبھی مرثیہ لکھتا ہے اور کبھی نوحہ، کبھی طنز کرتا ہے اور کبھی تنقید۔ یہ عذر نہیں حقیقت ہے۔ یہ گریز نہیں اظہار حال ہے۔ اس کا جواز بھی نجمؔ صاحب کی چند نظموں میں موجود ہے۔ جس میں قوم کی بے راہروی کا شکوہ ہے۔ ماتم ہے۔ دُکھ ہے ملال ہے۔ ملک وملّت کی بقاء اور استقامت کے لیے قوم میں جو جذبۂ خلوص وعمل ہونا چاہیے وہ مفقود ہے۔ اُس کا دور دور پتہ نہیں۔ حال ایسا کہ مستقبل کا کوئی روشن اشارہ نہیں ملتا، ماضی ایسا جو حال اور مستقبل پر نکتہ چینی ہے کہ کیا تھے اور کیا ہو گئے تم۔ یہ کون کہے، کون سمجھائے کہ ایسا کیوں ہوا۔ آج جو حال ہے، آج جو عالم ہے اُس کا اظہار نجمؔ آفندی کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

یہ نقشہ ہے کہ اُمیدوں پہ جیسے پھر گیا پانی
یہ صورت ہے کہ ارمانوں کی جیسے لُٹ گئی دنیا

شعاعِ مہرِ فطرت کا تبسم بن کے آتی ہے
مذاقِ بے محل سے بل رہا ہے سینۂ صحرا

وہ عالم ہے جہاں ہو اجتماعِ جسم وجاں مشکل

فقط حدِ نظر پر ہیں زمین و آسماں یک جا
کوئی حائل نہیں فطرت کی ترتیب مناظر میں

اب اک اہلِ نظر ہو اور یہ عالم بے حجابی کا
حقیقت بستیوں کی ایسے ویرانوں میں کھلتی ہے

ستارے ڈوبتے ہیں چین سے سویا کرے دنیا

ان اشعار میں طنز بھی ہے اور اظہارِ حقیقت بھی، یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ تا حدِ نظر زمین و آسمان تو یک جا نظر آئیں، مگر مخلوقِ خدا میں اتحاد نہ ہو۔ بستیاں ایسی جن کا عالم درد دیکھ کر ستارے ڈوب جائیں مگر بے ضمیری اور بے حجابی اپنے مقام پر رہے۔ اس تمام زیر و بم کو تجمل آفندی نے فطرت کے ساتھ مذاق بے محل کہا ہے، اور اس بے محل مذاق سے آبادی تو کیا سینۂ صحرا بھی جل اُٹھا ہے۔ یہ دردمندی اور یہ احساس تجمل کی شاعری کی ایک ایسی لازوال سچائی ہے، جس کے سبب وہ ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

○

ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی

نجم آفندی کی غزل گوئی

نجم آفندی کا تعلق بھی بیسویں صدی سے ہے۔ معروف شعراء کے خانوادے سے تعلق رکھنے کی بنا پر بچپن ہی سے ان کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ نجم آفندی جنہوں نے آگے چل کر نوحہ نگاری، قصیدہ نگاری اور سلام نگاری میں نام پیدا کیا، اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کرتے ہیں۔ انھوں نے پندرہ برس کی عمر میں اس دور کے معروف غزل گو، شاہ نیاز احمد وارثی کی ایک غزل کی تضمین کرتے ہوئے شاعری کی ابتدا کی۔ اس تضمین کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے۔

زہے عزّ و جلا لے بوترابے فخر انسانے[1]
علی مرتضیٰ مشکل کشائے شیر یزدانے

نجم آفندی اپنے والد بزم آفندی سے اصلاح لیتے رہے اور اٹھارہ برس کی عمر میں انھوں نے سیماب اکبرآبادی اور دیگر معروف شعراء کی موجودگی میں ایک مشاعرے میں جو غزل پیش کی اس کا مطلع تھا۔

چاندنی میں تم ذرا گھر سے نکل کر دیکھتے[2]
قبر عاشق اور اک میلی سی چادر دیکھتے

نجم آفندی کی، غزل سے یہ دلچسپی عمر بھر قائم رہی، اگر چہ بعد ازاں انھوں نے رثائی ادب کو زادِ آخرت کے طور پر حرز جاں بنائے رکھا۔ وہ مشاعروں سے زیادہ مذہبی مجالس، محافل،

---

[1] نورالحسن ہاشمی' ادب کیا ہے' سرفراز قومی پریس لکھنؤ س۔ن۔ص 70

[2] نجم آفندی (خودنوشتہ مشمولہ مجلہ النجم ص 275

مسالموں اور مقاصدوں میں شرکت کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ بایں وجہ ان کی زندگی میں غزل کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔ ان کے ایک خط سے ان کی دوسو کے قریب غیر مطبوعہ غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔ نجم آفندی کی غزلوں کا پہلا انتخاب، جس میں صرف پچاس غزلیں شامل ہیں، ان کی وفات کے چار سال بعد ''لہو قطرہ قطرہ''[1] کے نام سے شائع ہوا۔ گویا غزلوں کی کثیر تعداد اب بھی غیر مطبوعہ ہی ہے۔

گزشتہ صفحات میں بیسویں صدی کے جن غزل گو شعراء کا ذکر کیا گیا ہے، نجم آفندی نے ان کی موجودگی میں اپنی غزل کا چراغ جلائے رکھا۔ انھوں نے اپنی غزل میں جہاں ان شعراء اور اس عہد کے مجموعی رجحان کے اثرات قبول کیے، وہاں اس مقبول صنف سخن میں اپنی منفرد آواز کے ذریعے الگ سے اپنی پہچان بھی کرائی ہے۔ جب کوئی اہم غزل گو کسی سے اثرات قبول کرتا ہے تو اس کو اندھی تقلید نہیں بننے دیتا، بلکہ اپنے تجربے کے پیش نظر استفادہ کرتا ہے تا کہ شخصی تجربے کو ذات کی سطح سے بلند کیا جا سکے۔ نجم آفندی کے پاس سلام اور نوحے کے حوالے سے ایک ایسی مضبوط اور توانا آواز موجود تھی جسے صدائے احتجاج یا ظلم کے خلاف کلمۂ حق کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اہل بیتؑ سے محبت رکھنے کے باعث ایک ایسی محبت موجود تھی جس میں غم کو تقدس حاصل تھا۔ اس تناظر میں انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے عہد کی ملی جلی آوازوں سے استفادہ کیا۔ ان آوازوں میں ایک اہم آواز اقبالؔ کی تھی۔ نجم آفندی کی شعری جہت کے تعین میں حالیؔ اور اقبالؔ کی اصلاحی شاعری کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اردو کی عمومی شعری روایت کی تقلید میں نجم آفندی بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کرتے ہیں لیکن قوم کی اصلاح کی خاطر غزل کو سے زیادہ ملی شاعر کے طور پر اپنی پہچان کراتے ہیں۔ نجم آفندی کی غزل میں بھی ہمیں حالیؔ اور اقبالؔ کی بُو باس محسوس ہوتی ہے۔ نجم آفندی نے لہجے اور موضوع، دونوں سطحوں پر اقبالؔ کے اثرات کو قبول کیا جس کی ایک مثال ان کی اس غزل میں دیکھی جا سکتی ہے۔

لہو کا جوش دکھا لالہ زار پیدا کر　　خزاں کا چیر کے سینہ بہار پیدا کر
سبک خرامیِ برق و شرار پیدا کر　　جو رہگزار نہ ہو رہگزار پیدا کر

---

[1] نجم آفندی 'لہو قطرہ قطرہ' کراچی پرنٹنگ محل، ناظم آباد، ص 276

فضا مخالفِ سرمایہ دار پیدا کر　　دلِ غریب محبت شعار پیدا کر
نگاہِ ناز کی یہ سرد مہریاں توبہ　　نگاہِ شوق سے برق و شرار پیدا کر
تصورات کے نقش و نگار کیا ہوں گے　　تصرّفات میں نقش و نگار پیدا کر
غرور ظلم لرز جائے جس سے ٹکرا کر　　سکون و صبر کا وہ کوہسار پیدا کر
جہانِ عشق میں جس کو کبھی زوال نہ ہو　　کمال غم سے وہ نصف النہار پیدا کر

یہ اشعار پڑھ کر جہاں ردیف کے حوالے سے ذہن ''سکوتِ لالہ وگل سے کلام پیدا کر'' کی طرف منتقل ہوتا ہے، وہاں ایسے موضوعات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں جو اقبال کی شاعری سے مخصوص ہیں۔ اقبال بھی لہو کے جوش کا قائل ہے۔ وہ برق وشرار سے تحرک کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی غم ایک بڑی طاقت ہے اور عشق اپنا جہان پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس حوالے سے ثمین فاطمہ ''لہوقطرہ قطرہ'' کے دیباچے میں لکھتی ہیں۔

> ''اقبال نے غزل کو ایک نہایت ترقی یافتہ صنف شاعری کی حیثیت عطا کی۔ انھوں نے موضوعات کے تنوع، حقائق کی رنگارنگی کو غزل میں سمو کر یہ بات ثابت کردی کہ غزل فلسفۂ خودی، فلسفۂ حسن وعشق، مضامینِ تصوف اور تمام تر مسائل حیات کی ترجمانی کرسکتی ہے۔ چنانچہ بال جبریل کی غزلیں صحت مند تخیل، جاندار طرز بیان اور توانا فطری جذبات کا مرقع ہیں۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ غزل غالب، اقبال اور فانی کے بعد صرف نجم صاحب کے سہارے ہی سے صدیوں زندہ رہے گی تو بے جا نہ ہوگا۔''[1]

ان سطور کے آخر میں اگرچہ دیباچہ نگار کی رائے شدید طور پر مبالغہ آمیز نظر آتی ہے، تاہم اس سے ایک بات کا ضرور پتا چلتا ہے کہ نجم نے اقبال کے بنائے ہوئے راستے پر نہ صرف قدم رکھے بلکہ ایک طرح سے غزل میں اقبال ہی کے مشن کو لے کر آگے بڑھے۔

نجم کے عہد میں یاس یگانہ کی انا پرستی نے نجم کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ چنانچہ وہ اس سے صرف اس حد تک متاثر ہوئے کہ اس کی بلند آہنگی کو قبول کر کے اسے اپنی غزل کا حصہ بنایا۔ یگانہ مذہب گریز رویوں پر زیادہ زور دیتا ہے جب کہ نجم آفندی مذہب کو بڑی قوت سمجھتے ہیں۔ نظریاتی

---

[1] نجم آفندی خودنوشت مشمولہ مجلہ انجم ص 275

اختلاف کے باوجود وہ یگانہ سے متاثر ہیں۔ اس کی وجہ نظریئے سے زیادہ نجم کا یگانہ سے شخصی تعلق ہوسکتا ہے، جو حیدرآباد میں قیام کے دوران ایک عرصے تک دونوں کے درمیان رہا۔ نجم پر یگانہ کے اثرات کو واضح کرنے سے پہلے یگانہ کا یہ شعر دیکھیں:

سر پھرا دے انساں کا ایسا خبط مذہب کیا
سب تیرے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا

اب نجم آفندی کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھیں اور اندازہ لگائیں کہ موضوع میں بُعد کے باوجود نجم کے اشعار پر یگانہ کا لہجہ کس حد تک اثر انداز ہوا ہے۔

وقت کی پرستش ہے آدمی کا مذہب کیا — مدت مہذب کیا قوم نا مہذب کیا
موت کے سوا اب ہے زندگی کا مطلب کیا — دل ٹٹولنے والے دل میں رہ گیا اب کیا

یگانہ کا ایک شعر ہے:

اپنی ہستی میں بھی کچھ شک آ پڑا
علم کا سودا بڑا مہنگا پڑا

نجم آفندی کا یہ شعر دیکھئے:

دولت و علم کی منزل میں ہُوا ہے اکثر
اپنی ہستی پہ کوئی اور گماں ہو جانا

نجم کے ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل میں یگانہ کی انا اور بلند آہنگی سے متاثر ہیں۔ اور وہ ان عناصر کو اپنی غزل میں شامل کر کے دراصل اپنی انا پرستی اور بلند آہنگی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ نجم کے عہد کے ایک اور بڑے شاعر اکبر الہ آبادی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اکبر کی شاعری کا بنیادی وصف گہرا طنز ہے۔ جب انھیں اخلاقی پستی دکھائی دیتی ہے تو وہ اپنی حسِ طنز و مزاح کو کام میں لاتے ہیں اور زندہ رہنے والے اشعار تخلیق کرتے ہیں۔ نجم آفندی اپنی غزلوں میں جب اخلاقی پستی اور زوال کی بات کرتے ہیں تو ان کے ہاں مزاح تو پیدا نہیں

ہوتا البتہ اکبر کے طنز کے طور طریقے ضرور جھلکنے لگتے ہیں۔

مزاج پوچھ لیا میں نے راہِ مسجد میں　　جناب شیخ سے پھر سامنا کہاں ہوتا

نجم کے عہد پر غالب کے اثرات بڑے وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس عہد میں کوئی غزل کہے اور غالب کے اثرات سے پہلو بچا لے۔ نجم نے اگرچہ قوافی بدل کر غالب کی فضا سے نکلنے کی شعوری کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود وہ غالب کے اثرات سے دامن نہیں بچا سکے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ غالب سے بچتے بچتے اقبال کی شعری قلم رو میں داخل ہوگئے ہیں۔ نجم کی ایک غزل کے چند اشعار دیکھیں۔ قافیہ بدلا ہوا ہے۔ غالب نے ''بیاں اور گماں'' وغیرہ قوافی استعمال کیے ہیں۔ اقبال نے بھی اس زمین میں غزل کہی لیکن اقبال کی غزل دیکھ کر کہیں یہ گمان نہیں گزرتا کہ انھوں نے غالب کی زمین کو استعمال کیا ہے۔ لیکن نجم کی غزل دیکھ کر فوراً خیال غالب کی طرف جاتا ہے۔ غالب کی غزل کے اشعار دیکھئے:

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے　　رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اقبال کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اور اب نجم کے اشعار دیکھئے۔

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور　　مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور

ہر جادۂ منزل میں ہے سجدے کی ادا اور　　معبد کی فضا اور ہے مقتل کی فضا اور

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا　　تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وفا اور

(''لہوقطرہ قطرہ'' ص 22)

اس منزل میں غالب اور اقبال کے ملے جلے اثرات صاف مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں۔ نجم آفندی کی ایک اور غزل بھی غالب کے اثرات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں بھی نجم نے قافیہ بدل کر غالب کے اثر سے آزاد ہونے کی کوشش کی ہے لیکن غالب کے اثرات جیسے ہر شعر سے چپک کر رہ گئے ہیں۔ غالب کے اشعار ہیں:

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

حجم آفندی کہتے ہیں:

جان لیوا ہے ترا جان جہاں ہو جانا کس و ناکس کے قریب رگِ جاں ہو جانا
اس سے کیا صبر کے معیار میں فرق آتا ہے عظمتِ غم سے مرا اشک فشاں ہو جانا
عشق ایثار کا وہ نقطۂ آخر ہے جہاں زندگی میں ہے فراقِ تن و جاں ہو جانا
حجم بہتر ہے تصنع کی دل آویزی سے تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیان ہو جانا

(غ م)

حجم آفندی نے کلاسیکی شعراء اور معاصر شعراء سے اثرات قبول کر کے ایک نیا شعوری رنگ وضع کیا جو غزل میں ان کی پہچان بن گیا۔ حجم کی غزلوں کے مطالعہ سے غزل کے بارے میں ان کا ایک واضح شعری تصور ابھرتا نظر آتا ہے۔ وہ محض ہوا میں تیر چلانے کے قائل نہیں تھے، بلکہ اپنے عہد کی جیتی جاگتی زندگی کو اساس بنا کر ہر شعر کو مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بناتے تھے۔ ان کی غزلوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے رجعت پسندی سے بیزاری کا اظہار کیا اور موضوعات کے حوالے سے غزل میں تنوع پیدا کیا۔ فلسفہ، منطق، وعظ حکمت جیسے موضوعات کو اپنایا اور پیچیدہ مسائل تک کو غزل کے ایمائی پیرائے میں بیان کیا۔ انھوں نے نوحہ، نعت، مرثیہ، منقبت، سلام اور قصیدہ جیسی اصناف کو بھی غزل کے دامن میں سمونے کی شعوری کوشش کی۔ لفظ اور خیال میں مطابقت پیدا کی اور بھاری بھرکم الفاظ سے خیال کی لطافت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ حجم نے اپنے شعری نظریات ایک غزل میں یوں بیان کئے ہیں:

بن گئی قوسِ قزح جب لے کے انگڑائی غزل فکر کے ظلمت کدے میں روشنی لائی غزل
فلسفہ منطق سیاست موعظہ حکمت حدیث علم و فن کی ہر بلندی پر نظر آئی غزل
حمد و نعت و منقبت نوحہ قصیدہ مرثیہ کتنے عالم اپنے دامن میں اُٹھالائی غزل
رزم میں بھی کارفرما بزم میں بھی نغمہ کار نازشِ اسکندری و فخر دارائی غزل
اللہ اللہ دامنِ پیغمبری تک دسترس رفعتِ فکرِ سلیماں بن کے اترائی غزل

ہے یہاں روئے سخن حسنِ حقیقت کی طرف   اہلِ ظاہر کے لیے ہے وجہ رسوائی غزل
(لہو قطرہ قطرہ) ص45

اس طرح تجمؔ اپنی ایک رباعی میں فلسفہ غزل میں بیان کرتے ہیں:

رنج و غم سہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں   جب میں چپ رہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں
مری غزلوں سے ٹپکتا ہے میرے دل کا لہو   دردِ دل کہہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں
(لہو قطرہ قطرہ) ص45

تجمؔ آفندی کے ان شعری نظریات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے حال دل کے اظہار کے لیے دیگر اصناف کے مقابلے میں غزل ہی کو قابل اعتنا سمجھا ہے۔ بنیادی طور پر نوحہ نگار ہونے کے باعث تجمؔ نے غزلیہ اشعار میں بھی شہادت امام کا ذکر کیا ہے۔لیکن ان کی غزلوں میں شہادت امام محض بین نہیں، بلکہ اس تاریخی واقعہ کے پاتال میں اتر کے ایک تجزیاتی انداز میں صورتحال کو سمجھنے کا رجحان ملتا ہے۔وہ ظلم کو ظلم کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔انسان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔انھوں نے اقبالؔ کی طرح انسان کی خودی اور خودداری کے اثبات پر زور دیا ہے۔ان کی روشن خیالی، انسان کی خودداری کے نقوش جگہ جگہ پیدا کرتی نظر آتی ہے۔اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے:

میں اپنے زعمِ بلندی میں مٹ گیا لیکن   کبھی نشانہ احساسِ کمتری نہ بنا
ہر ایک در پر نہ جا تجمؔ داد کی خاطر   کمالِ شعر و سخن کو گدا گری نہ بنا
(غ م)

کمالِ فن مرے دست طلب سے دور نہ تھا   مگر قبول نہ تھی شرطِ انکسار مجھے
(غ م)

آساں ہی سہی ہم سے خوشامد نہیں ہوتی   دشوار ہے وہ کام جو کرنا نہیں آتا
(غ م)

شریک حال تھی عہدِ جنوں میں خود داری   زبان پر بھی نہ افسانۂ بہار آیا
(غ م)

حق نا شناس میرے مخاطب نہیں ہیں نجم　　خود داری سخن کو سخن داں سے کام ہے
(ص 108)

کوشش تو نجم دوائے دنیا نے کی بہت　　بھولے سے بھی "غم" نہ کہا میں نے "لا" کے بعد
(غ م)

درج بالا اشعار کی روشنی میں ایک ایسے انسان کا تصور نگاہوں میں ابھرتا ہے جس میں انا اور خود داری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ایسا انسان جو بلند نشینی کے خواب دیکھتا ہے۔ احساس کمتری کو اپنے نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنے شعر وسخن اور کمال فن پر بھی کسی سے داد کا طالب نہیں ہے کیونکہ شعر وسخن پر داد طلب کرنے کو وہ بھیک کے مترادف سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر محبوب التفات برتنے میں غرور کا مظاہرہ کرے تو نجم آفندی ایسے التفات کو بھی پسند نہیں کرتے۔

باعثِ زندگی سہی، میں وہ قبول کیوں کروں　　ساتھ ہے التفات کے ان کا غرورِ التفات
(لہو قطرہ قطرہ)

نجم کے اشعار میں شاعرانہ تعلّی کی بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اکثر غزل گو شعراء نے اپنی شاعرانہ عظمت کو بیان کرنے کے لیے تعلّی کے اشعار کہے ہیں۔ نجم آفندی نے ان اشعار میں ایک تو روایت کا بھرم رکھا ہے، دوسرے ان میں ان کی افتادِ طبع کو بھی خاصا دخل رہا ہے۔ اگرچہ شاعرانہ تعلّی کی ایک سے زیادہ وجوہ ہوسکتی ہیں مگر ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب کوئی خوددار شاعر یہ دیکھتا ہے کہ اس کی وہ پذیرائی نہیں ہو رہی جس کا وہ مستحق ہے، تو وہ ردِعمل میں آکر تعلّی کا شکار ہو جاتا ہے۔ نجم آفندی کے ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنے لفظ کی قدر و قیمت کا پوری طرح احساس تھا۔ شاعرانہ تعلّی کے حوالے سے نجم کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے:

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زورِ طاقت کیا　　وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

حق ناشناس مجھ سے ملاتے نہیں نظر　　جس دن سے سامنا مری فکر و نظر کا ہے
(لہو قطرہ قطرہ ص 45)

اے نجم کتنے اہلِ سخن نے میرے سخن کے چہرے اتارے
(لہو قطرہ قطرہ)

تجمل کی غزل میں موضوعات کے تنوع کا اوپر ذکر ہوا۔تجمل نے غزل کے روایتی موضوعات میں بھی یکسانیت سے ہٹ کر بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔دیکھا جائے تو عشق،غزل کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔اس سلسلے میں دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کے ہاں عشق کی الگ الگ کیفیات کار فرمانظر آتی ہیں۔تجمل آفندی کا تصورِ عشق دبستانِ دہلی کے شعراء کے مزاج کے قریب ہے۔وہ درد میں نشاط کی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور نشاط میں درد کی، ان کی داستانِ عشق بے زبان کی زبان سے ادا ہوتی ہے۔وہ راز کی بات چھپاتے ہیں۔جب شامِ غم آتی ہے تو چاند بھی کمھلایا ہوا لگتا ہے۔وہ غمِ عشق میں فریاد کو کفرانِ نعمت سمجھتے ہیں۔تجمل آفندی عشق کی گہری کیفیتیں بیان نہیں کرتے بلکہ معلوم کیفیتوں تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔لیکن ان کے اشعار کی بُنت ایسی ہوتی ہے کہ ان میں ایک تازہ کاری کا احساس موجود رہتا ہے۔ان کے تصورِ عشق کے حوالے سے حتمی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ دردمندی ہی دراصل ان کے ہاں عشق کا دوسرا نام ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ یہ دردمندی غزلوں سے دل کا لہو بن کر ٹپکے۔اس حوالے سے تجمل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

مری زندگی سے اب بھی ترا فاصلہ بہت ہے　　　مرے دل تک آنے والے مرے دردِ دل تک آنا
(لہو قطرہ قطرہ) ص19

کتنے سودے ہو رہے ہیں دردِ دل کے نام پر　　　کس قدر چھپتا رہا ہوں بات کہہ کر راز کی
کچھ کمی شامِ غم کے اثر میں نہیں　　　چاند کمھلا گیا رات ڈھلنے لگی
(غ م)

کفرِ نعمت ہے غمِ عشق میں فریاد نہ کر　　　زیست کی شان یہ ہے موت کو بھی یاد نہ کر
(غ م)

آج کچھ اور ہیں تیور مرے دردِ دل کے　　　عرض کرنا ہے تو کر، آج کچھ ارشاد نہ کر
(غ م)

ہوا جو ذکر محبت کے درد مندوں کا
ہمارا نام بھی شاید برائے نام آیا
(غ م)

کانپ اٹھا میں دیکھ کر دردِ محبت کا اثر　　رو دیا وہ سنگدل بھی مجھ کو سمجھانے کے بعد
(غ م)

ان اشعار کو پڑھ کر ایک اور بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ نجم دبستان دہلی کے ہم مزاج ہونے پر بھی کہیں کہیں ان سے مختلف ہیں۔ مثلاً وہ خودسپردگی کے مرحلے سے نہیں گزرتے ہیں۔ وہ روتے ہیں تو ساتھ ان کا محبوب بھی روتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا محبوب گوشت پوست کا انسان ہے۔ وہ نجم کی باتوں پر ردعمل ظاہر کرتا ہے اور کبھی تخاطب میں نجم آفندی کے تیور بھی دیکھنے والے ہوتے ہیں۔

گزشتہ صفحات میں نجم آفندی کی غزل پر اقبال کے جن اثرات کا ذکر ہوا، وہ محض زبان وبیان کی حد تک تھے۔ نجم کے کلام میں اقبال کی ایک فکری جہت، جس کا تعلق حرکت وعمل سے ہے، ایک مستقل حیثیت کے طور پر نظر آتی ہے۔ نجم نے اپنے نوحوں، رباعیوں، منقبتوں اور سلاموں کی طرح اپنی غزلوں میں بھی درسِ عمل دیا ہے اور طرح طرح سے قوم کے احساس خفتہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ نجم آفندی زندگی کو میدانِ عمل بنانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عمل میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ دل میں اندھیرا ہو تو حسنِ عمل سے وہاں اجالا ہوسکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر حوصلہ سلامت ہو تو اکیلا آدمی، کارواں ہو کر منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

دل میں کر حسنِ عمل سے روشنی　　اس اندھیرے کا اُجالا اور ہے
(لہو قطرہ قطرہ) ص 60

موت کو بھی دو قدم ہٹنا پڑا　　زندگی میدان میں جب ڈٹ گئی
(لہو قطرہ قطرہ) ص 33

کیا خاکِ مذلت سے ابھرتی نہیں قومیں　　کیا ڈوب کے نبضوں کو ابھرنا نہیں آتا
(غ م)

عزم محکم ہو تو گر گر کے سنبھلتا ہے بشر　　راہِ تدبیر میں اندیشۂ افتاد نہ کر
(غ م)

انھیں پھیلے ہوئے ہاتھوں کو سرگرم عمل کردو اندھیرے میں خطِ تقدیر پڑھوانے سے کیا ہوگا
(غ م)

درس عمل کی بات کرتے ہوئے نجم آفندی اپنے عہد کی سائنسی رفتار سے بھی کہیں کہیں ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔ ان کے عہد میں امریکہ اور روس میں چاند تک پہنچنے کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے مرثیے 'معراج فکر' میں بھی ایک بند چاند کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ اور غزلوں میں بھی اس طرف اشارے ملتے ہیں۔ یہ سفر بھی ان کے ہاں عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

بشر وہ کیا ہے اگر چاند تک پہنچ نہ سکے زمیں پہ جس کے لیے چاندنی اُتر آئی
(لہوقطرہ قطرہ ص 41)

کرتے رہو تم تابہ قمر جانے کی کوشش جانا ہے مجھے خالقِ صد شمس و قمر تک
(غ م)

سب نے اپنے اپنے مقصد کے بنا رکھے ہیں چاند اپنی اپنی حد میں سب نے چاند تک پرواز کی
(غ م)

نجم آفندی نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت ہمارے شاعروں کا ایک پسندیدہ موضوع سرمایہ ادرانہ نظام کی مخالفت کرنا تھا۔ اقبالؔ، جوشؔ اور راشدؔ کے ہاں سرمایہ داری کے خلاف شدید طنز ملتا ہے۔ نجم آفندی نے بھی محدود سطح پر اس موضوع کو اردو غزل میں بیان کیا ہے۔

فضا مخالفِ سرمایہ دار پیدا کر دلِ غریب محبت شعار پیدا کر
(لہوقطرہ قطرہ) ص 11

غرورِ ظلم لرز جائے جس سے ٹکرا کر سکون و صبر کا وہ کوہسار پیدا کر
(غ م)

درج بالا موضوعاتی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نجم آفندی نے زیادہ تر اپنے عہد کے موضوعات اختیار کیے لیکن روایت کے مکمل شعور کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ کہیں کہیں انھوں نے روایتی غزل کے پیش پا افتادہ مضامین بھی باندھے لیکن ان میں وہ نیا پہلو تلاش نہ

کر سکے اور تازہ کاری پیدا نہ کر سکے۔ ایسے مضامین میں انھوں نے روایتی شاعری کے کرداروں، مثلاً واعظ، شیخ، رند، زاہد کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

گناہ نشر کیے اُس کے خوب واعظ نے　　خدا کی راہ میں جس جس کا دل دکھانا تھا
(لہوقطرہ قطرہ) ص 30

دیکھ اے واعظ مرا عرشِ سخن　　میں ترے منبر پہ جاکر کیا کروں
(غ م)

سنتا ہوں کہ سیدھے ہیں بہت حضرتِ واعظ　　دھوکے میں چلے آئے تھے میخانے کے در تک
(غ م)

واعظ کو مبارک درِ توبہ کا سہارا　　یا رب مجھے دنیا سے گنہگار اٹھالے
(غ م)

کہہ دے کوئی واعظ سے کہ یہ سجدہ گزاری　　محدود نہیں ہے طلب سجدہ و سر تک
دے رہے تھے بے عمل درسِ عمل　　ہم بھی سب سن کر سمجھ کر رہ گئے
(غ م)

نجم آفندی نے ان شعری کرداروں کو خالصتاً روایتی معنوں میں استعمال کیا ہے یعنی واعظ وہی عالم بے عمل، لوگوں کو جہنم سے ڈرا کر اپنا مطلب نکالنے والا، شیخ وہی دوہری شخصیت کا مالک، رند وہی مست مئے خود اور زاہد وہی پارسا جو اپنی پارسائی پر اتراتا پھرتا ہے اور دوسرے کو گنہگار تصور کرتا ہے۔

نجم آفندی کی غزل کے یہ ملے جلے رنگ ایک ایسے شاعر کا پتا دیتے ہیں جو بیک وقت قدیم اور جدید کے رویوں کی آمیزش سے ایک ایسا شعری پیکر تخلیق کرتا ہے جو نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی رجحانات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ فنی اور تخلیقی سطح پر فن کی نئی دنیاؤں کا متلاشی بھی ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ نجم کی غزل اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے روایت اور اپنے عہد کے اسلوب کا خوبصورت امتزاج ہے۔ انھوں نے اپنی غزل میں وہ سوز و گداز پیدا کیا جس کی جڑیں ان کے رثائی کلام میں موجود ہیں۔ نجم اپنے تخیل اور اسلوب کے زور پر ان جڑوں پر

ایسا شجر سایہ دار استوار کرتے ہیں جو غزل کی فضا میں برگ و بار پیدا کرتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی غزل لطیفِ کلام اور اثر کے اعتبار سے انہیں بیسویں صدی کے قابل ذکر غزل کو شعراء میں ایک اہم مقام عطا کرتی ہے۔

O

محترمہ ثمین فاطمہ

نجم کی غزلیں

لفظ غزل میں عشق اور وارداتِ عشق، حسن اور جلوہ طرازیِ حسن، واقعاتِ ہجر، لذتِ وصال، بادہ وساغر، شراب وشباب اور گریۂ تبسم کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔ خمریات کے علاوہ ریختہ پر بھی کافی توجہ دی جاتی رہی۔ اس کے علاوہ چشم وابرو، خط رخسار اور نشیب وفرازِ بدن کا ذکر، غزل کی چاشنی سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح غزل اپنے ارتقائی منازل میں صرف انہی موضوعات کا مظہر رہی۔ انشاء، مصحفی، شیفتہ وناسخ سب اسی روش پر چلتے رہے۔ اس طرح غزل کی ایک مخصوص ہیئت بن گئی اور غزل اپنی اسی ہیئت کی بنا پر پہچانی جانے لگی۔ اس وقت یہ سوچا بھی نہ جاسکتا تھا کہ غزل کو کسی اور قالب میں بھی ڈھالا جاسکتا ہے۔ اسرارِ کائنات، جام وسبو کی تہ سے نکل کر سطح جام تک آسکتے ہیں۔ پرانی روایات اور فرسودہ رواج پر زلف محبوب سے خطِ تنسیخ کھینچی جاسکتی ہے، نشیب وفراز بدن کے بجائے نشیب وفرازِ زندگی سے لوگوں کو آشنا کرایا جاسکتا ہے۔ مرزا غالبؔ نے غزل کے لیے کسی قدر الگ راہ متعین کی تھی۔ لیکن صرف اسی حد تک کہ طنز کے لہجے میں عذاب وثواب، جنت ودوزخ اور حوروغلمان کے تذکرے کرتے رہے۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ غالبؔ کے بعد کوئی شاعر اردو غزل کو کسی نئی نہج پر لا کھڑا کرے گا۔ لیکن علامہ اقبالؔ نے غزل کو ایک نہایت ترقی یافتہ صنفِ شاعری کی حیثیت عطا کی۔ انھوں نے موضوعات کے تنوع، حقائق کی رنگارنگی کو غزل میں سمو کر یہ بات ثابت کردی کہ غزل فلسفۂ خودی، فلسفۂ عشق وحسن، مضامین

تصوف اور تمام تر مسائلِ حیات کی ترجمانی کرسکتی ہے۔ چنانچہ بالِ جبریل کی غزلیں صحت مند تخیل، جاندار طرز بیان اور تو انا فطری جذبات کا مرقع ہیں۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ غزل، غالبؔ، اقبالؔ اور فانیؔ کے بعد صرف نجمؔ صاحب کے سہارے ہی سے صدیوں زندہ رہے گی، تو بے جا نہ ہوگا۔

نجمؔ صاحب کے ذہنی شعور اور ان کی غزلوں کی ہیئت کے پیشِ نظر ان کا دور اقبالؔ کے اواخر سے شروع ہوکر جوشؔ اور فیضؔ کے ساتھ چلتے ہوئے احمد فرازؔ، عبید اللہ علیمؔ، کشور ناہیدؔ اور فہمیدہؔ ریاض سے پہلے ہی ختم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں پھر خط وخالِ محبوب، نشیب وفراز بدن اور عریانیت و فحاشی کے موضوعات ملتے ہیں۔ نجمؔ صاحب کا مجموعہ غزلیات ''لہو قطرہ قطرہ'' صنفِ غزل میں ایک عظیم اور قیمتی سرمائے کا اضافہ ہے اور ان اقدار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جن سے اقبالؔ نے غزل کو آشنا کیا، اس نہج کا آئینہ دار ہے، جس کو انقلابیوں نے پسند کیا، ان مسائل کو سموئے ہوئے ہے، جو ادب برائے زندگی کا خاصہ ہیں۔

نجمؔ صاحب کے یہاں غزل زندگی اور اس کے ماحول کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر سموکر نہایت لطیف انداز میں پائیدار ادب کو جنم دیتی ہے، ان کی غزلوں میں اختصار ہے، خیال کی گہرائیاں ہیں، فکر کی بلندیاں ہیں، یہ غالبؔ کی طرح صرف یہ تمنا کرکے نہیں رہ جاتے کہ

ع: کاش کہ پر ے ہوتا عرش سے مکاں اپنا

بلکہ وہ پستی ہمت کے ثنا کی ہیں۔ ان کے یہاں بلندی کی حد نہیں ملتی کہ

حریف عزم نہ ہوتی جو پستیِ ہمت
نہ جانے کتنی بلندی پر آشیاں ہوتا

اقبالؔ کی خودی ان کے یہاں خودداری کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ راہ عشق میں بھی راہِ رضا سے ہوکر گزرتے ہیں۔ دل کے تلاطم کی ترجمانی کے

لیے وہ نغمہ کے بجائے نوحہ کا انتخاب کرتے ہیں ۔

گزار دوں شبِ غم ایک ہی تبسم میں
سحر کے رُخ پہ ستارہ سا جگمگاؤں کیا
شبِ غم نہ ہوگی چراغوں سے روشن
یہ تارے کدھر جگمگانے چلے ہیں

لیکن میرؔ کی طرح وہ زودار آواز میں فریاد وفغاں نہیں کرتے اور نہ ہی وہ ناکامیِ عشق پر گریہ کناں ہیں۔ اس کے برعکس ان کے کلام میں اعتماد اور یقین ہے۔

آئیں گے ضرور وہ ان سے یوں کہے کوئی
ان کی راہ، جاں نثار دیکھتا چلا گیا

ان کے نزدیک صرف غزل جلوہ طرازیِ حسن اور وارداتِ عشق کی متحمل نہیں ہوتی بلکہ

قصیدہ عرض کیجیے نجمؔ شانِ حسن میں کوئی
وہ کہتے ہیں غزل ارشاد فرمانے سے کیا ہوگا

مرزا غالبؔ کی واعظ سے درِ میخانہ پر ملاقات ہوتی ہے تو وہ آنکھیں چُرا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس نجمؔ صاحب آنکھیں چرا کر نکل نہیں جاتے، بلکہ جناب شیخ کی مزاج پُرسی کرتے ہیں۔

مزاج پوچھ لیا میں نے راہِ مسجد میں
جناب شیخ سے پھر سامنا کہاں ہوتا

مفت کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالبؔ اس انفرادی تجربہ کو زمان ومکان کی حدود سے آزاد کر کے نجمؔ

صاحب یوں آفاقیت عطا کرتے ہیں کہ

رنگ لائیں گی غلط سرمستیاں ہر دَور میں
لٹتا جائے گا یونہی میخانہ میخانے کے بعد

علامہ نجم آفندی صاحب جوشؔ کی طرح انقلاب کے بلند و بانگ نعرے نہیں لگاتے، نہ ہی چیخ و پکار اور توڑ پھوڑ کا شور مچاتے ہیں، بلکہ وہ صرف دھیمی آواز میں پیامِ انقلاب دیتے ہیں۔

جناب نجم آفندی نے چھوٹی بحروں میں بھی کامیاب تجربے کئے ہیں۔ ان کے کلام میں ہمیں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ لیکن وہ تصوف میں ڈوب کر نہیں رہ جاتے، حقائق کی نشان دہی کرتے ہیں، نشتریت نہیں۔ اسرارِ حیات و کائنات کا ذکر ضرور کرتے ہیں، لیکن اس میں الجھ کر نہیں رہ جاتے۔

ان کا یہی دھیما دھیما انداز — ہلکی آواز میں صدائے انقلاب — نرم روی سے حقائق کی نشان دہی — عشق مگر عقل کی رہنمائی کے ساتھ — پندونصائح کا دفتر کھول کر نہیں بیٹھ جاتے۔ نہ مشکل قوافی کا انتخاب — ان کا یہی وہ منفرد اسلوب ہے جو صنفِ غزل میں انھیں ایک منفرد، ممتاز اور جاوداں مقام عطاء کرتا ہے۔

○

منتخب اشعار غزلیات

(268)

بہت میکش جہاں دو گھونٹ میں آپے سے باہر تھے
کے معلوم ہے ہم نے وہاں آنکھوں سے پی کب تک

آج اردوے معلّٰی کی اشاعت کے لیے
یہ غنیمت ہے کہ تجمّل نکتہ داں باقی رہا

یہ بھی اک حادثہ اردو کی محبت کا ہے تجمّل
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

زبان شاعر کامل پہ ہو اگر اے تجمّل
میری نظر میں تعلّی کوئی گناہ نہیں

غالب کی طرح معترف میرؔ ہوں میں تجمّل
فیضِ سخن سے جس کے غزل معتبر ہوئی

ہر بندۂ اللہ کو اپنا سا نہ سمجھو
ایسے بھی ہیں بیٹھے ہیں جو کونین سنبھالے

میں فکرِ خیر میں ہوں وہ شر کر چکا بہت
دشمن بچے گا اب نہ میرے انتقام سے

مصیبت پر مری خوش ہونے والے بھی ہیں دنیا میں
بُرا کیا ہے مرا غم دشمنوں کے کام آتا ہے

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی
کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

کیا پوچھتے ہو دیدۂ پُرنم کی منزلت
بنتے ہیں جمؔ دیدۂ پُر نم سے آدمی

دنیا سے لگا تھا دل تو بہت
اٹھنا ہی پڑا محفل ہی تو ہے

انھیں بھی جمؔ دیکھا ناصیہ سا میرؔ کے در پر
جو اپنے زعم میں آگے ہیں کچھ غالبؔ کی منزل سے

میں اپنے زعمِ بلندی میں مٹ گیا لیکن
کبھی نشانہ احساسِ کمتری نہ بنا
ہر ایک در پہ نہ جا جمؔ داد کی خاطر
کمالِ شعر و سخن کو گدا گری نہ بنا

میں خود ہوں مطمئن اے جمؔ ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

یہ کسی نے بھی نہ دیکھا آگ پروانہ میں تھی
یہ زمانہ دیکھتا ہے آگ میں پروانہ ہے
پرسشِ احوال پر جز شکر کچھ کہتے نہیں
بوریے پر بھی مزاجِ اہلِ دل شاہانہ ہے

باطن میں مرا دوست ہے ظاہر میں ہے دشمن
کہہ دے جو مرے عیب مرے سامنے آ کے

ہزاروں قہقہوں میں گم نہ ہو جائے صدا میری
اکیلا کیا کروں انسانیت پر نوحہ گر ہو کر
نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے
نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہو کر
ہنر مندوں کا آپس میں حسد اے جمؔ کیا معنی
ہنر سے دشمنی رکھتے ہیں یہ اہلِ ہنر ہو کر

رندوں میں اور بڑھ گیا رحمت کا اعتبار
واعظ ترے بیانِ عذابِ خدا کے بعد

اک مشت خاک ہی سہی نسبت تو دیکھئے — کونین میں مقامِ بشر ہے خدا کے بعد
کوشش تو حجم دولتِ دنیا نے کی بہت — بھولے سے بھی نعم نہ کہا میں نے لا کے بعد

خود ساختہ ملّا کے پیرایۂ حکمت نے — پرورۂ صحت کو بیمار بنا ڈالا
مذہب کے مسائل میں ڈالے ہیں وہ الجھاوے — آسان شریعت کو دشوار بنا ڈالا

شریکِ حال تھی عہدِ خزاں میں خود داری — زباں پر بھی نہ افسانۂ بہار آیا

تمھارے ذوقِ تکلم کا یہ تقاضا ہے — تمھاری بزم میں ہر شخص بے زباں ہوتا
بُرا کہا مجھے دشمن نے خیریت گزری — زبانِ دوست کا اک حرف بھی گراں ہوتا

ملا جو عیب کہیں ہم نے چشم پوشی کی — ہنر جہاں نظر آیا بصد نظر دیکھا
مجھے انیسؔ کی عظمت پہ رحم آیا حجم — وہ رنگ چہرہ یومِ انیسؔ پر دیکھا

کوئی تدبیر کیجیے میں نہیں تقدیر کا قائل — مری حالت پہ لفظوں میں ترس کھانے سے کیا ہوگا

عشق ایثار کا وہ نقطۂ آخر ہے جہاں — زندگی میں ہے فراقِ تن و جاں ہوجانا

رحم کے قابل ہے اس کا عالمِ بے چارگی — کہہ دیا جس نے بہت کچھ اور سوچا کچھ نہ تھا
فطرتِ انساں پہ جب تک عشق تھا پرتو فگن — جوہرِ انسانیت کو حجم خطرہ کچھ نہ تھا

غرورِ ظلم لرز جائے جس سے ٹکرا کے — سکون و صبر کا وہ کوہسار پیدا کر

کس کو ہے خبر مرحلے طے کتنے کئے ہیں   اک قطرۂ ناچیز نے تعمیر گہر تک

کوئی حسینؑ کا ایثار تجمؔ کیا سمجھے   کسے ہے وسعتِ مفہومِ کربلا معلوم

فلسفہ منطق سیاست موعظہ حکمت حدیث   علم و فن کی ہر بلندی پر نظر آئی غزل
حمد و نعت و منقبت نوحہ قصیدہ مرثیہ   کتنے عالم اپنے دامن میں اٹھا لائی غزل
میرؔ و غالبؔ کی غزل ہے تجمؔ و ثاقبؔ کی غزل   تجھ سے ارضِ تاج نے کی بزم آرائی غزل

رحمت نے گنہ گاروں کو خود حشر میں ڈھونڈا   واعظ نے مجھے مار ہی ڈالا تھا ڈرا کے

شمع و پتنگ غنچہ و گل نغمۂ نشاط   اے بزمِ عیش کھیل یہ سب رات بھر کا ہے
میرے سوا کسی کو نہیں میری معرفت   چرچا جگہ جگہ مرے عیب و ہنر کا ہے

نبضِ ہستی پر ہے صدیوں سے ہماری انگلیاں   جب مرض میں ہوگی تبدیلی دوا بدلیں گے ہم
یہ خیالِ خام ہے کس کم نظر کج فہم کا   مسندِ شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

بدلا ہے تجمؔ کیا معیار شعر فہمی   جب سطحِ شاعری سے نغمے نے سر ابھارا

مسخ ہوتے ہیں ارادے بارہا   کوئی شاید کار فرما اور ہے

سفر تھا کون سا ایسا جو بے جھجک نہ ہوا   رہے گا پوری طرح کامیاب شک نہ ہوا
بہت بڑا مجھے کرنا ہے اک سفر اے دوست   اسی کے واسطے سامان آج تک نہ ہوا

آج کچھ اور ہیں تیور مرے دردِ دل کے
عرض کرنا ہے تو کر آج کچھ ارشاد نہ کر

عزمِ محکم ہو تو گر گر کے سنبھلتا ہے بشر
راہِ تدبیر میں اندیشۂ افتاد نہ کر

ایک دن ایک گھڑی ایک نفس کی مہلت
غمِ دنیا سے جو مل جائے تو برباد نہ کر

درِ زنداں سے بھی دنیا کو سبق دیتے ہیں
فکر آزاد ہے جس کی وہ گرفتار ہیں ہم

دوش پر ہم نے اٹھا رکھا ہے کونین کا بار
کون کہتا ہے زمانے کے لیے بار ہیں ہم

نہ محبت کے نہ دولت کے طلب گار ہیں ہم
کم سے کم عزتِ انساں کے تو حقدار ہیں ہم

ہر فضا میں ہمیں رہنا ہے نمایاں ہوکر
آج سردار نہیں ہیں تو سرِ دار ہیں ہم

ہم نے دنیا سے بگاڑی ہے بہت حق کے لیے
حرفِ حق ہے جو بغاوت تو گناہ گار ہیں ہم

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور
مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور

یہ دور جو اے تجم ہے اردو کا مخالف
اس دور میں اردو کی ہوئی نشو و نما اور

ستم شعاروں کے ہاتھوں ہزاروں ظلم سہے
خیال میں بھی نہ احساس انتقام آیا

فرشتے رہ گئے خاموش فرطِ حیرت سے
وہ راہِ عشق میں انسان کا مقام آیا

مارا ہے کس کے داؤں سے دنیا سے کیا کہوں
میں دوست سے قریب تھا دشمن سے دور تھا

خبر کیا خانہ بربادوں کی تم کو
خدائی ہے خداوندی ہے گھر میں

شبِ غم رنگ لائی جاتے جاتے
لگادی آگ دامانِ سحر میں

اجل آنے سے پہلے کچھ نہ سمجھے
بہت کچھ تھا حیاتِ مختصر میں

کب تک رہیں گے آخر شام و سحر کے شکوے
تو جیسے چاہتا ہے شام و سحر بنا لے

ہر عیب سے ہے مشکل دامن بچا کے چلنا
جس عیب کی ہوس ہو اس کو ہنر بنا لے

پھر دو جہاں بھی تیرے کون و مکاں بھی تیرے
اپنی نظر کو بالکل اپنی نظر بنا لے

بُرے بھلے میں کوئی خاک امتیاز کرے
وہ پیرہن ہوں جو یوسف کو کھو کے ناز کرے

نہ اقتدارِ دو روزہ پہ کوئی ناز کرے
کسے خبر ہے وہ کل کس کو سرفراز کرے

جو سوچتا ہوں وہ دنیا سے کہہ نہیں سکتا
خدا کسی کو نہ یوں مبتلائے راز کرے

سکونِ دل سے تمنّا ہے ایک سجدہ کی
خدا نصیب اگر فرصتِ نماز کرے

مانگی ہے ان سے موت نہ مانگی تھی زندگی
دامن کبھی یہ دامنِ سائل نہیں رہا

میں نے لیا ہے قوّتِ بازو سے اپنا حق
شرمندۂ نوازشِ باطل نہیں رہا

تیز گامی پر نہ جا اے رہنمائے کارواں
ایسے کتنے کارواں آگے بڑھے اور تھم رہے

نقش آب و گل کی ایسی خودسری اچھی نہیں
سرکشِ نافہم گردن میں ذرا سا خم رہے

میں یہ کہتا ہوں کہ محفل میرے ساتھ اٹھ جائے گی
یہ نہ کہیے تجھ کو محفل سے اٹھا سکتا ہوں میں

مجھ کو واعظ رشک مسجد کی امامت پر ہو کیا؟
جب نمازِ عشق مقتل میں پڑھا سکتا ہوں میں

غم کی یہ تاریک راتیں اور تسلّی کا پیام
شمع کی زحمت نہ کیجئے دل جلا سکتا ہوں میں

نظر والو حقیر و ناتواں ہم ہیں مگر ایسے
کہ آج اتنی بڑی دنیا کی نظروں میں کھٹکتے ہیں

فرشتے گرد بھی ان منزلوں کی پا نہیں سکتے
جہاں ہم خاکسارانِ ازل دامن جھٹکتے ہیں

سراپا جرم ہو کر بھی میں بندہ ہوں وہ خالق ہے
کہیں اس طرح کے مضبوط رشتے ٹوٹ سکتے ہیں

کریں کیا بندگانِ وقت حق کہتے جھجکتے ہیں
گلے میں لفظ اظہارِ حقیقت کے اٹکتے ہیں

میں فکرِ خیر میں ہوں وہ شر کر چکا بہت　　دشمن بچے گا اب نہ میرے انتقام سے

جن کی ہشیاری کے دنیا میں نشانے تھے بہت　　وہ بھی مارے گئے خود اپنی ہی ہشیاری سے
بزمِ انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل　　ایک ذرّہ نہیں محفوظ ادا کاری سے

تابوت و شامیانہ و قبر و چراغ و گل　　اللہ آج بھی سر و ساماں سے کام ہے

ہر بندۂ اللہ کو اپنا سا نہ سمجھو　　ایسے بھی ہیں بیٹھے ہیں جو کونین سنبھالے

یہ کسی نے بھی نہ دیکھا آگ پروانے میں تھی　　یہ زمانہ دیکھتا تھا آگ میں پروانہ ہے
ساری دنیا اک فریب جلوۂ جانا ہے　　یہ حرم ہے دور سے نزدیک سے بت خانہ ہے
کچھ ہوا دے دیں اگر بیرون در کی کوشش　　گھر جلانے کے لئے حاضر چراغِ خانہ ہے

اندازۂ محفل تو مجھے دور سے بھی تھا　　کچھ اور بھرم کھول دیا پاس بٹھا کے
باطن میں مرا دوست ہے ظاہر میں ہے دشمن　　کہہ دے جو مرے عیب مرے سامنے آ کے

شمع و پتنگ غنچہ و گل نغمۂ نشاط　　اے بزمِ عیش کھیل یہ سب رات بھر کا ہے

یہ خیال خام ہے کس کم نظر کج فہم کا　　مسند شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

میں حریمِ ناز میں در آ گیا　　پردۂ کونین سرکاتا ہوا
جم کیا روکے گی یہ دنیا مجھے　　میں نکل جاؤں گا ٹھکراتا ہوا

مری نظروں میں کتنے حادثے آئے تبسم کے　　بچھائی اور سمیٹی چاند نے جب چاندنی اپنی

زہے قسمت اسی کے ہاتھ سے مارے گئے آخر
چھپا رکھی تھی جس نے دوستی میں دشمنی اپنی

نہ جسے نظر نے دیکھا نہ جسے خرد نے جانا
یہ جلال و جبر دیکھو اسے مان لے زمانا

مجھے اس روش سے دنیا کی بڑا سکوں ملا ہے
مرے غم کو غم نہ سمجھا مرے دل کو دل نہ جانا

میں گزر کو کر رہا ہوں ابھی درگزر سے لیکن
مرا ہاتھ ہوگا کاری جو پڑے گا ہاتھ اٹھانا

زباں دانِ محبت ہی نہیں تم
تمھیں کیا قدر ہو اُردو زباں کی

ہر اک کی لغزشیں دیکھیں ہر اک کو ٹوک دیا
مری نگاہ تھی اور مجھ کو دیکھتی نہ رہی

صلہ کچھ اس کے سوا تجم کو نہیں منظور
اگر ذریعۂ عزت یہ شاعری نہ رہی

ہر اک زبان پہ چرچا ہے سرفروشوں کا
اجل کے سائے میں کیا زندگی نکھر آئی

کچھ ایسے خاک نشیں اہلِ دل بھی گزرے ہیں
اجل بھی آئی سرہانے تو پوچھ کر آئی

یہ دور وہ ہے کہیں سے جواب تک نہ ملا
ہر ایک در پہ محبت سلام کر آئی

زندہ دلوں نے بارہا بحرِ فنا سے دی نجات
یہ نہ سنبھالتے اگر ڈوب گئی تھی کائنات

یقین ہے کہ ستارے جگہ سے ہٹ جائے
قدم جو ہم بھی اٹھاتے تو راستا ملتا

حیات و علم و نشاط و صلا و دانش و مرگ
بشر کو اور لباسِ بشر میں کیا ملتا

ایسے ایسے بھی ہیں مردِ اعتبار
کھودیا ظاہر کو باطن کے لئے

تجم دنیا میں بہت سے کام ہیں
آدمی درکار ہے جن کے لئے

میں شبِ غم کے طلاطم میں اکیلا ہوں مگر — آس ہے اک جانی پہچانی ہوئی آواز کی

رحمت کا اعتبار بھی جاتا ہے ہاتھ سے — اب کر چکے گناہ تو پروا نہ کیجئے
مفہومِ زندگی ہے محبت کا ایک دن — دو دن کی زندگی پہ بھروسہ نہ کیجئے

آسانیوں کے دور کا حاصل نہ پوچھئے — سب کچھ ہے صرف حوصلۂ دل نہیں رہا

میرے لہو سے میرا چمن لالہ زار ہے — کیا اس سے بڑھ کے اور دلیلِ بہار ہے
ہم اعتبارِ وقت کی حد سے گزر چکے — اب وہ ہیں ان کا وقت ہے اور اعتبار ہے
میں فرشِ میکدہ پہ بھی ہوں مثلِ بوئے گل — واعظ غریب مسند و منبر پہ بار ہے
کچھ کرلیا اُسی نے جو یہ سوچ کر اٹھا — میری ہے جیت سارے زمانے کی ہار ہے

تم خود ہی دیکھ لوگے غمِ زندگی میں ہم — ڈوبے ہوئے سے ہیں کہ ڈبوئے ہوئے سے ہیں

حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی — قصورِ فکر و نظر ہے جو تشنگی نہ رہی
پڑا رہا ہے عداوت پہ عمر بھر پردا — مگر نگاہِ محبت کبھی چھپی نہ رہی
کہاں وہ عہدِ گذشتہ کی دوستی اے دوست — وہ دشمنی کی شرافت وہ دوستی نہ رہی

دانۂ گندم سے ہیں محروم آج — پھانکتے تھے کل جو موتی کوٹ کر

دنیا بنا کے لے گا کیا دورِ زندگی میں — میں دل بنا رہا ہوں تو دل میں گھر بنالے
کچھ آسماں سے بھی ہے اونچا میرا تخیل — تو زیرِ آسماں کچھ دیوار و در بنالے

یہ نازِ حُسن مری عاشقی کے دم سے تھے
تمھارے دل میں ہوں بولو زباں پہ آؤں کیا

نام تو ساتھ نہ جائے گا خدا حافظ ہے
ایک رہ جائے گی دنیا میں امانت میری

شوق کی آگ رُکے گی نہ دبے گی اے دوست
اُڑ کے پہنچے گی یہ پروانوں سے پروانوں میں
مدفنوں پر جو شہیدانِ محبت کے ملی
مسجدوں میں ہے وہ رونق نہ صنم خانوں میں

پہلو میں برائے نام ہے دل اب درد کا دل میں نہیں
مومن ہیں مگر ایمان نہیں مسلم ہیں مگر اسلام نہیں

کہیں خود بھی بدلتا ہے زمانہ
زبردستی اگر بدلا نہ جائے
وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں
جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے

اب اتنی تو ہمّت کیے جایئے
اجل آئے تک ہی جیے جایئے

مرزا سوز دل دیکھ لے گا زمانہ
گرجتے برستے شرر دے رہا ہوں

دل کی وسعت اور ہے محفل کی وسعت اور ہے
ظلم ہوتا ہے کسی پر یاد آجاتا ہوں میں
کوئی خوش خوش جب نظر آتا ہے قید و بند میں
دیکھ کر خود اپنی آزادی کو شرماتا ہوں میں
میری پستی پر نظر کر اپنی ہستی دیکھ کر
اے خدائے آب و گل انسان کہلاتا ہوں میں

سخت جانی سے ہے میری اسی دنیا کو گلہ
اِسی دنیا نے کیا موم سے فولاد مجھے
عرض کرتے ہوئے گزرا ہے زمانہ بے سود
دی ہے احساس نے اب ہمّتِ ارشاد مجھے
اپنی ہمّت کے مطابق ہے ہر انسان کی فکر
کوئی ناشاد سمجھتا ہے کوئی شاد مجھے

اعلانِ غربت کا اب اردو زباں سے ہے
پوچھے تو کوئی بہ لب و لہجہ کہاں سے ہے

طفلی میں بے خرد تھا جوانی میں بے حواس
میں کیا کہوں گناہ کی منزل کہاں سے ہے

ایک وجہِ تسکیں ہے طاعت و اطاعت کیا
حق ادا نہیں ہوتا حوصلہ نکلتا ہے

سختیاں کرتی گئیں نزدیک مقصد سے مجھے
مشکلوں میں دن بہ دن آسانیاں دیکھا کیا

میں جہانِ غم میں رہ کر ہوں الگ غمِ جہاں سے
نہ شریکِ کارواں ہوں نہ جدا ہوں کارواں سے

انھیں آج سانس لینا بھی ہوا قفس میں مشکل
جو ہوا میں پھر رہے تھے کبھی سیر آشیاں سے

بجھ چلا تھا دل مرا زادِ سفر کم دیکھ کر
کیا تسلّی ہوگئی سرمایۂ غم دیکھ کر

اک شعلۂ فانی پر مٹ جائے گا پروانہ
انجام سے غافل ہے آغاز کا دیوانہ

ترتیبِ عناصر میں فرق آ ہی گیا اک دن
آخر میں قفس رہتا کب تک مرا کاشانہ

اور بھی کوئی مذہب ہے سوا محبت کے
میرا ہے یہی مذہب پوچھے ہو مذہب کیا

مجھ سے اٹھ سکتا نہیں احسانِ اربابِ کرم
پھول بھی پھینکے جو کوئی آگ ہو جاتا ہوں میں

نشیمن میرا رہنے دو چمن میں آنچ اگر آئی
نشیمن ہی پہ آئے گی چمن پر آ نہیں سکتی

خوشی ہو یا ہو غم اک ٹھیس ہے دل کی لطافت پر
سمجھ میں ہر کس و ناکس کے یہ بات آ نہیں سکتی

ہمیشہ دل دُکھائے گا خدا کی راہ میں واعظ
یہ رندوں کو بُرا کہنے کی عادت جا نہیں سکتی

جیسے وہ یاد فرمائیں کہیں رکتا ہے روکے سے
زمانہ دیکھتا رہتا ہے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں

ہماری سمت جب اٹھتی ہے تنقیدی نظر کوئی
ہم اپنا عیب ان کا تذکرہ کر کے چھپاتے ہیں

ہم تو ہندوستان والے ہیں
کاش ہندوستاں ہمارا ہو

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی
کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

بے نیازی اس قدر کس کام کی
بھولے بھٹکے حال پوچھا کیجئے

سحر آتی ہے جب نزدیک تارے جھلملاتے ہیں
یہ ظالم آخر لمحوں پہ اپنے مسکراتے ہیں

خودی ہے بیخودی ہے بندگی ہے کفر ہے کیا ہے
دوا بھی چھوڑ دی میں نے دعا بھی چھوڑ دی میں نے
کوئی آساں نہ تھا اظہارِ درد و مدعا کرنا
بڑی مشکل سے کی الفاظ کی صورت گری میں نے

قلق ہے اشکِ ندامت میں ڈوب جانے کا
ملا نہ خون میں اپنے مزا نہانے کا
نیاز عشق کجا اور نمازِ خوف کجا
ادائے فرض میں ہے فرض سر جھکانے کا
بہت بلند ہے ہستی مری مگر اے جگر
میں ایک ذرّہ ہوں ناسخ کے آستانے کا

خاک کے پتلوں پہ ہنستی ہے زمیں
آسماں تک سر اٹھا کر رہ گئے

کیا ستم ہے آدمی راضی ہو اس تقدیر پر
دولتِ دنیا زیادہ آدمیت کم رہے
ہم نے دیکھے ہیں یہ منظر زندگی کی دوڑ میں
جو زیادہ سے زیادہ تھے وہ کم سے کم رہے

آج تک تو جیتا ہوں اپنے ہی سہارے پر
چاہتے ہیں یہ کہہ دوں آپ کا سہارا ہے

کسی دن آسماں کو ہم بنالیں گے زمیں اپنی
زمیں ان کو مبارک جو زمیں کو آسماں سمجھے

غم ہے بہت اے دوست خوشی کم ہے جہاں میں
جو کچھ بھی تری ہمّتِ مردانہ اٹھالے

آمد و شد ہر نفس کی دے رہی ہے یہ پیام
حق کو آنا چاہے باطل کو جانا چاہیے

عمر بھر پرورش فکر و نظر ہوتی ہے
زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

وطن میں ہیں جیسے کوئی بے وطن ہو
کسی پر خدا یہ مصیبت نہ ڈالے

در زنداں سے بھی دنیا کو سبق دیتے ہیں
فکر آزاد ہے جس کی وہ گرفتار ہیں ہم
ہر فضا میں ہمیں رہنا ہے نمایاں ہوکر
آج سردار نہیں تو سرِ دار ہیں ہم
ہم نے دنیا سے بگاڑی ہے بہت حق کے لئے
حرفِ حق ہے جو بغاوت تو گنہگار ہیں ہم

یہ گت بنا کے جاؤں میں کیا اُس کے سامنے
تخلیقِ کائنات پر جس کو غرور تھا
خدا کو میں نے بہ فیضانِ عشق مان لیا
خرد زدوں کو دلائل میں سر کھپانا تھا

ہزاروں قہقہوں میں گم نہ ہوجائے صدا میری
اکیلا کیا کروں انسانیت پر نوحہ گر ہوکر
دیا کرتا ہے انساں اپنے دل کو بھی فریب ایسا
خبر سب کچھ ہے اور بیٹھے ہوئے ہو بے خبر ہوکر
نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے
نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہوکر
ہنر مندوں کا آپس میں حسد اے جمؔ کیا معنی
ہنر سے دشمنی رکھتے ہیں یہ اہلِ ہنر ہوکر

اک مشتِ خاک ہی سہی نسبت تو دیکھئے
کونین میں مقام بشر ہے خدا کے بعد

تمھارے ذوق تکلّم کا یہ تقاضا ہے — تمھاری بزم میں ہر شخص بے زباں ہوتا
بُرا کہا مجھے دشمن نے خیریت گزری — زبانِ دوست کا اک حرف بھی گراں ہوتا

رحم کے قابل ہے اس عالِم بے چارگی — کہہ دیا جس نے بہت کچھ اور سوچا کچھ نہ تھا

اس بھری دنیا میں اک انساں نظر آتا نہیں — زعم کتنا بڑھ گیا انسان کہلانے کے بعد

گلہ ہو شکر ہو تقریر ہو کہ شعر تجمّ — یہ طول ٹھیک نہیں اختصار پیدا کر

کس کو خبر مرحلے طے کتنے کیے ہیں — اک قطرۂ ناچیز نے تعمیرِ گہر تک

کیوں اضافہ کر کے اٹھو تجمّ بزم شعر سے — وقت کا مصرف کہیں تحصیل حاصل میں نہ ہو

خدا محفوظ رکھّے خود پرستی خود نمائی سے — ان آئینوں میں جو منہ دیکھ لے ہو جائے دیوانہ

زمیں جب پاؤں سے نکلی تو ہم باز آ گئے سر سے — کہ ایسے وقتِ بد میں دوش پر بارِ گراں کیوں ہو

بہت ممنون ہوں احباب کی چشمِ عنایت کا — مری کمزوریاں دیکھیں نظر اپنی طرف کم کی
لہو کے گھونٹ پی کر بھی کہیں سیری نہیں ہوئی — بجھاتی ہے کسی کی تشنگی اک بوند شبنم کی
اٹھا کر دہر سے رسم محبت اہلِ دنیا نے — اضافہ علم و حکمت میں کیا انسانیت کم کی
عجب کیا شرک کا الزام آئے میرے سجدے پر — محبت دل میں ہے اے تجمّ اک انسانِ اعظم کی

جبر کا شکنجہ تھا میری ناتواں گردن — موت نے چھڑایا ہے زندگی کی باہوں سے

فرش پر ہے تخت ان کا عرش پر دماغ اپنا
کیا فقیر رہتے ہیں دب کے بادشاہوں سے
کیا ہوگا فیصلہ مری ذوقِ نگاہ کا
دنیا کو دیکھتے ہیں سب اپنی نگاہ سے

زندگی بھر اِدھر اُدھر دیکھا
آج اپنی طرف نگاہ کریں
آدمی سے ہو کیوں نظر نیچی
اپنے اللہ کا گناہ کریں
دشمنی میرا کیا بگاڑے گی
دوست بن کر مجھے تباہ کریں

ناز بے جا نہ کر بلندی پر
ہر بلندی کی اصل پستی ہے
کتنی مہنگی ملے دریغ نہ کر
پھر بھی عزّت کی موت سستی ہے
اپنے اپنے بنالیے ہیں خدا
ہر پرستش میں خود پرستی ہے

حیات وعلم ونشاط و ملال و دانش ومرگ
بشر کو اور لباسِ بشر میں کیا ملتا

زہے قسمت اُسی کے ہاتھ سے مارے گئے آخر
چھپا رکھی تھی جس نے دوستی میں دشمنی اپنی

میں عشق کے تصدق انسان بن گیا ہوں
زیرِ قدم فرشتے آنکھیں بچھا رہے ہیں

ظاہر ہے ایک باب نہاں ایک باب ہے
یہ کائناتِ دہر ادھوری کتاب ہے
اپنی خرابیوں پہ کسی نہ نظر نہ کی
ایک ایک کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے

نہ کس طرح تری رحمت کا آسرا کرتے
اگر گناہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے
زہے جلال کے شاہوں کو دستِ قدرت نے
کیا لحاظ نہ ہم صورتِ گدا کرتے

نجم یہ نشانی ہے اہلِ دل کی دنیا میں ہم کو خاص نسبت ہے غم کی بارگاہوں سے

میرزا نجم سے نہ کچھ کہنا چاہے جو کچھ یہ کج کلاہ کریں

راس آئے جناب نجم تمھیں سالکِ جادۂ وفا ہونا

اشکوں کی روحیں نجمی دل کا لہو بہا کر غم کی نوازشوں کو رنگیں بنا رہے ہیں

میں غالبؔ و ناسخ کا ہم آواز ہوں اے نجم بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں ہے

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زور و طاقت کیا وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

میں نجم خود ہی سراپا نیاز ہوں ورنہ مرے کمال کی چوکھٹ پہ سر جھکا کرتے

نجم بہتر ہے تصنّع کی دل آویزی سے تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہوجانا

کوئی حسینی کا ایثار نجم کیا سمجھے کسے ہے وسعتِ مفہوم کربلا معلوم

نجم فطرت سے مری ولولۂ شعر و ادب میرے ایک ایک نفس میں ہے غزل خواں کوئی

بدلا ہے نجم کیسا معیارِ شعر فہمی جب سطحِ شاعری سے نغمہ نے سر ابھارا

ناز تسبیح و مصلّا اور ہے زیرِ خنجر ہو جو سجدا اور ہے

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زور و طاقت کیا وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

ہماری فکر کا اندازہ دیکھ کر اے نجم فلک سے کیا یہ غزل کی زمیں اُتر آئی

محتاج شرح جو ہو وہ نجم شاعری کیا ہر شعر پر یہ قدغن دنیائے راز ہوجا

اے نجم کتنے اہلِ سخن نے میرے سخن کے چربے اتارے

مرے منہ سے جھڑتے رہے پھول نجم زباں شاخِ گل سی لچکتی رہی

نجم کتنے ہوں گے عرفی کی طرح نشتر و لا و نعم سمجھے ہوئے

کیا ڈھونڈتی ہے نجم نگاہِ سخن شناس ہم اپنے کیفِ شعر میں کھوئے ہوئے سے ہیں

نجم خدا سے آج تک راست معاملات نہیں بندۂ در اسی کا ہوں جس نے مجھے جگا دیا

نجم ہر شعر میں ترنم ہے آج شاعری ہے نے نواز ان کا

یوں تو سو بہانے ہیں نجم کچھ نہ کرنے کے قصد ہے تو کر ڈالو آج کل اور اب تب کیا

کسی کو نجم خوشی ہو تمھارے غم سے اگر دعا کرو کہ خدا عمرِ غم دراز کرے

آپ دو آنسو بھی اپنے نجم پی سکتے نہیں پینے والا ڈگڈگا کر زہر بھی پی جائے ہے

کبھی نجم طوفاں اٹھانا بھی ہے کہاں تک یہ آنسو پئے جایئے

نجم مغرب کی فضا بھی کانپ جاتی ہے کبھی گوشۂ مشرق سے وہ پیغام پہنچاتا ہوں میں

نجم تقدیر کی گردش سے میں دبنے کا نہیں پست ہمّت نہ کرے وقت کی افتاد مجھے

تخلیق کائنات کا عنوان دیکھنا اے نجم ابتدائے محبت کہاں سے ہے

زادۂ ایراں ہے تو پروردۂ ہندوستاں یہ دو عالم مانتے ہیں تیری یکتائی غزل
نجم میرے ہم وطن ہیں غالبؔ و میرؔ و نظیرؔ کیوں نہ کرتی میرے در پر ناصیہ سائی غزل

نجم صاحب کو راستہ دینا مذہبِ عشق کے امام آئے

میرے لیے آرام کہاں مسجد کا امام ہوں نہ منبر کا خطیب

بزمِ انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل ایک ذرّہ نہیں محفوظ ادا کاری سے

وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے

عیش کیا سخت سزا دیتا ہے مقصدِ زیست بھلا دیتا ہے

عمر بھر پرورشِ فکر و نظر ہوتی ہے زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

نجم کے سخن میں اب درد ہے قیامت کا پہلے لعل اُگاتا تھا خون اب اُگلتا ہے

یہ تو نجم آپ کی ہی ہے وہ دوام شعر گوئی مرے دل پہ چوٹ لگتی ہے صلائے نکتہ داں سے

تجمّ افراط محبت نے مجھ گم کردیا میں نے آنکھیں بند کرلیں شدّتِ غم دیکھ کر

اے تجمّ میں پتلا ہوں رنگ اور تلوّن کا کس رنگ میں لکھے گی دنیا مرا افسانہ

تجمّ یہ خندہ جبینی ہر بلائے عشق پر کس تبسّم کا خزانہ میرے آب و گل میں ہے

محبّت ہے کیوں تجمّ ہندوستاں سے چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

بزمِ سخن میں آگئے تجمّ خودی کو چھوڑ کر بن گئے کب سے آدمی رختِ جنوں اُتار کر

تجمّ ہم موحد ہیں ہم پہ کیا اثر ہوتا بے شمار بدلے ہیں رنگ روپ دنیا نے

حقائق ہی رہیں گے تجمّ میری سعی کا حاصل خیال و خواب میں فکر سخن الجھا نہیں سکتی

سوتے سوتے جاگ اٹھی کیفیتِ شعر و سخن جس کسی محفل میں پہنچے تجمّ ہم ہی ہم رہے

ہم نے منزلت دی تجمّ نظمِ اردو کو ہر زمین پر ہم نے آسماں اتارا ہے

میں پھیلاتا ہوں نور اے تجمّ اپنے کنجِ عزلت سے زمین شعر میرے دم قدم سے آسمانی ہے

وہ کون ہے اے تجمّ جو میخانہ میں آکر ساغر میرے آگے سے حریفانہ اٹھالے

شکستہ پا ہو جب اے تجمّ یہ ذوقِ سفر کیسا دلیلِ کارواں ہونا تھا گردِ کارواں کیوں ہو

علّامہ نجمؔ آفندی
کی
غزلوں کا مجموعہ

فہرست غزلیات

شمار	مطلع	تعداد شعر	مطبوعہ
1	مرا دل ہے نقشِ دوامِ محبت	7	//
2	کفرِ نعمت ہے غمِ عشق میں فریاد نہ کر	7	//
3	مست وہ عیش میں ہیں غم سے گراں بار ہیں ہم	17	//
4	ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور	11	//
5	مری نظر میں نہ معیارِ صبح و شام آیا	11	//
6	خدا کی یاد کو بھی میکدہ میں آنا تھا	15	//
7	سچ ہے کہ وہ قریبِ رگِ جاں ضرور تھا	11	//
8	کسی دن داغِ گمراہی رہے گا ان کے سر ہو کر	17	//
9	احساسِ التجا بھی نہیں التجا کے بعد	13	//
10	ہر ایک دوست کو دشمن کو میں پکار آیا	13	//
11	جو اپنے دل کے طلاطم کا ترجماں ہوتا	10	//
12	نہ پوچھئے غمِ دوراں میں کیا اثر دیکھا	12	//
13	زمانے کی فضا میں انقلاب آنے سے کیا ہوگا	10	//
14	دے کے دل میں بے قرار دیکھتا چلا گیا	11	//
15	کھل گیا جامۂ ہستی کا گراں ہو جانا	14	//
16	خواب خوش کہنے ہی کو اپنا تھا اپنا کچھ نہ تھا	12	//
17	پھر نہ اٹھا کوئی فتنہ حشر ہو جانے کے بعد	13	//
18	جنوں کا جوش دکھا لالہ زار پیدا کر	18	//
19	پہنچیں گے نہ گمراہ تری راہ گزر تک	17	//
20	سوئے ابل بھی جائیں گے اس کرّ و فر سے ہم	19	//
21	حدِ گناہ میں آجاتی ہے نگاہ کبھی	14	//

شمار	مطلع	تعداد شعر	مطبوعہ
22	مجھے کرنا ہے کچھ پروانۂ آتش بجاں ہو کر	18	//
23	بن گئی قوسِ قزح جب لے کے انگڑائی غزل	16	//
24	دلی جذبات کے برعکس یہ صورت گری کب تک	13	//
25	آڑ ہے کعبہ کی سجدہ روئے جاناں کی طرف	13	//
26	لٹ لٹا کر تھا جو کچھ وہ بھی کہاں باقی رہا	10	//
27	اس قدر شدّتِ احساس میں ڈوبا ہوا ہوں	16	//
28	کبھی یوں کہیں سر جھکانے چلے ہیں	12	//
29	پینگ ان سے بڑھ رہے ہیں وہ دل پہ چھا رہے ہیں	13	//
30	کبھی چتون سے وضع کا رفرمائی نہیں جاتی	7	//
31	راہ رضا میں کہیں مصرفِ گناہ نہیں	12	//
32	سوچتا ہوں مصرفِ حق سعی باطل میں نہ ہو	11	//
33	بھر تو دے موت ذرا عمر کے پیمانے کو	9	//
34	پھر ادھر دیکھتے چلے جاؤ	10	//
35	میرے دل میں جو دل تمھارا ہو	9	//
36	سنو گے مجھ سے میری ڈوبتی کشتی کا افسانہ	11	//
37	نگاہِ دوست کی بے التفاتی رائیگاں کیوں ہو	13	//
38	مسلسل قہقہوں سے ہے تلافی شدّتِ غم کی	13	//
39	کس کرب سے وہ رات قفس میں بسر ہوئی	11	//
40	جب میں چاہوں گا شبِ غم مختصر ہو جائے گی	10	//
41	محبت کی نگاہوں کو نظر میں لا نہیں سکتی	9	//
42	بیکسوں کی صفِ ماتم پہ ہے رقصاں کوئی	21	//
43	عجب کیا عیش کی غفلت میں سارا دن گزر جائے	7	//

شمار	مطلع	تعداد شعر	مطبوعہ
44	کیوں اس کو چھیڑتے ہو شبِ غم کے نام سے	13	//
45	زندگی غم میں گزرتی ہے رواداری سے	11	//
46	انساں سے لاکھ دور ہوں انساں سے کام ہے	10	//
47	شب ہے تمام صبح کا تا رانظر میں ہے	8	//
48	مرتے مرتے اہلِ دل کیا سختیاں دیکھا کیے	14	//
49	اے تنگ نظر عشق کے جذبوں کو جگا لے	9	//
50	رہتے ہیں دور مرحلۂ غم سے آدمی	9	غیر مطبوعہ
51	دل ہم سے نہ سنبھلا دل ہی تو ہے	6	//
52	یہ خودداری ہے یا بیگانگی ہے رنگِ محفل سے	11	//
53	صلوٰۃ وصوم سے آئین سرکشی نہ ہنا	7	//
54	ملی ہے موت بھی قسمت سے شاہکار مجھے	15	//
55	زیست کی حد ہے جہاں تک ہمّت مردانہ ہے	8	//
56	خاکے جو بنے عزم وعمل سے شہدا کے	11	//
57	مجھے بھی دل پہ میرے اختیار ہے کہ نہیں	4	//
58	موت لائے زندگانی لے گئے	6	//
59	میرے نفس نفس میں اشارہ سفر کا ہے	11	//
60	کیا خبر تھی زندگی کا مدّعا بدلیں گے ہم	6	//
61	کچھ عقل نے بگاڑا کچھ عشق نے سنورا	9	//
62	نازِ تسبیح ومصلّا اور ہے	8	//
63	مرا آغوشِ نظر یاد آیا	8	//
64	فضائے عشق میں لایا گیا ہوں	5	//
65	خداوندیاں ہیں ستم رانیاں ہیں	7	//

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ
66	میں نے دیکھا ہے شباب آتا ہوا	7	//
67	بچ کے جو طوفانِ غم سے تر گئے	5	//
68	دنیا جسے ملتی ہے محبت نہیں ملتی	8	//
69	پھر غم و درد کی دھوپ ڈھلنے لگی	9	//
70	جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر	7	//
71	اللہ اللہ اہلِ دل کی دسترس	9	//
72	سنا سب کچھ جو سننا تھا کہا سب کچھ جو کہنا تھا	5	//
73	سکونِ دل کی لذت چاہتا ہوں	6	//
74	بلا ہے محبت ہماری تمھاری	7	//
75	کوئی ڈوبے کوئی ابھر آئے	7	//
76	میرے مزاجِ درد کو رسوا نہ کیجئے	7	//
77	کیا اپنا سانس لینا آہیں سی بھر رہے ہیں	6	//
78	فکر و دانش آزما کر کیا کروں	8	//
79	کچھ ایسی وضع کے دل ایسے غم بھی ہوتے ہیں	7	//
80	کیسی خموشی کیسے اشارے	8	//
81	خوش رہے خاک چھاننے والا	7	//
82	پوچھے کیا ہو جلالت اُس حریم ناز کی	11	//
83	دنیا سے گزرتا ہے گزرنا نہیں آتا	6	//
84	کسے غرض تھی جو ہو کی فضا میں جا ملتا	6	//
85	جی رہے ہیں سہل و ممکن کے لئے	6	//
86	مجھے بھی دل پہ مرے اختیار ہے کہ نہیں	7	//
87	تعمیرِ آدمیت ترکیبِ رنگ و بو ہے	8	//

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ
88	ستم کو مذہب و ملت کا آسرا نہ رہے	6	//
89	حال پر بار ہا زوال آئے	10	//
90	یہ بھی ہے کوئی زندگی کیا یہی کائنات ہے	6	//
91	اے درپے سیاست آگاہِ راز ہو جا	6	//
92	زندہ دلوں نے بارہا بحرِ فنا سے دی نجات	11	//
93	بادۂ تلخ کام کیا کرتا	7	//
94	جلوے ترے نظر میں سموئے ہوئے سے ہیں	7	//
95	حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی	13	//
96	قفس میں جو ہمیں توہینِ غم نظر آئی	14	//
97	بیٹھے ہو کب سے منہ کو موڑے	7	//
98	اسی کے دم قدم سے ہے یہ شانِ رہبری اپنی	7	//
99	بہت بڑھ چلی زندگانی ہماری	7	//
100	نہ جسے نظر نے دیکھا نہ جسے خرد نے جانا	10	//
101	کہوں گا کچھ نہ قلبِ ناتواں کی	9	//
102	زمیں بوئے خوں سے مہکتی رہی	10	//
103	زخمِ دل زخمِ زباں سب سہہ گئے	7	//
104	خوب بیٹھے ہیں بہم سمجھے ہوئے	8	//
105	گھر میں خزاں کا دور چمن میں بہار ہے	9	//
106	وقت کی پرستش کیا آدمی کا مذہب کیا	12	//
107	تبسّم ہو کہ آنسو چشمِ تر میں	8	//
108	زورِ سخن سے اک جہاں روز نیا بنا دیا	7	//
109	عشق تھا حُسنِ کارساز ان کا	9	//

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ
110	راہِ وفا کے راہی کچھ ہم سفر بنا لے	14	//
111	بُرے بھلے میں کوئی خاک امتیاز کرے	15	//
112	کیوں اے فضائے درد کہیں دل نہیں رہا	12	//
113	موت کی آغوش میں بھی زیست کا دم خم رہے	15	//
114	بے حسوں کو درد کی منزل میں لا سکتا ہوں میں	8	//
115	غریبوں کی جسارت پر وہ منہ حیرت سے تکتے ہیں	10	//
116	نہ گدائی مجھے دے اور نہ سلطانی دے	6	//
117	شکستہ ہوش نہیں ہوں شکست پاؤں کیا	10	//
118	عشق کو حُسن بنانے کو چلے	7	//
119	ان کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے یہ دولت میری	9	//
120	درد ہے خیال ان کا زندگی ہے خواب ان کا	5	//
121	میرے ہونٹوں پر تبسّم میرے دل میں ہائے ہے	6	//
122	حریم ناز کا پردہ اُٹھا کے چھوڑ دیا	5	//
123	ان کو دیکھا بے خودی سی ہوگئی	6	//
124	کہاں ہے محبت کو کیا ہوگیا	10	//
125	دردِ دل حاصل نظر پایا	5	//
126	ہم دکھائیں گے جو سُن آئے ہو افسانوں میں	10	//
127	وہ دور چلے گا تا بہ کجا مئے جس کی سبیل عام نہیں	11	//
128	محبت کی وہ آہٹ پا نہ جائے	9	//
129	اب اتنی تو ہمت کیے جایئے	5	//
130	ترے نام کو رہگذر دے رہا ہوں	9	//
131	کائناتِ غم کو خاطر میں کہاں لاتا ہوں میں	16	//

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ
132	لب پہ کس کس کا نام آتا ہے	16	//
133	کیا سکوں دے گی نئے دور کی روداد مجھے	15	//
134	اعلانِ غریت کا اب اردو زباں سے ہے	19	//
135	ہونا لفظوں میں ادا عشق کا وہ جوش نہ تھا	10	//
136	وہ بھی تھا وقت کہ محفل میں تری بار نہ تھا	11	//
137	عشق حسنِ فطرت ہے دل جو یوں پگھلتا ہے	6	//
138	مرنے والا مرتے مرتے سختیاں دیکھا کیا	14	//
139	یہیں آئے دن رہیں گے جو فسادِ باغباں سے	13	//
140	رنگ کچھ سے کچھ ہوا نیرنگ عالم دیکھ کر	8	//
141	لائی غفلت مجھے دنیا کی ہوا کھانے کو	7	//
142	روتے نہ کٹے اور تڑپتے نہ بسر ہو	10	//
143	وہ حسن سے بے تاب و اک عشق میں دیوانہ	15	//
144	جس کو سو آسانیاں تھیں وہ بھی کچھ مشکل میں ہے	10	//
145	ان کا سکوں تباہ کئے جا رہا ہوں	4	//
146	وہ جلوہ گر نہیں تو نگاہوں میں کیا رہے	8	//
147	شراب و شعر و نغمہ کے اثر کی یاد آتی ہے	10	//
148	بہت ہیں یوں تو پروانے حرم کی شمع سے پوچھو	6	//
149	درِ ساقی کھلے اک سجدۂ مستانہ ہو جائے	9	//
150	حسن ہے ان کا ایک قیامت کیا کہیے	3	//
151	مرِ حق میں خاموشی حوصلہ کی پستی ہے	4	//
152	میرا وہ غم رہا نہ وہ ان کی خوشی رہی	9	//
153	کون خدا خدا کرے وقت کا مقتضا نہیں	9	//

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ
154	اُس نظر کی چوکھٹ کھا کر رہ گئے	11	//
155	دشمنی سہی لیکن دوست بن کے مارا ہے	13	//
156	مسافر ہوں مگر کیا زندگانی پر حکمرانی ہے	8	//
157	امیدِ صبح کیوں دِل حسرت اثر نہیں	15	//
158	تجھ میں ہو اگر جرأت رندانہ اٹھالے	13	//
159	نگاہیں میرے پہچانے مرادِ دِنہاں سمجھے	15	//
160	کہنے کو حقیقت کی تلخی پتھر سا کلیجا کون کرے	14	//
161	طلب کرتا ہے سجدہ ان کا آئینِ خودی مجھ سے	7	//
162	دل وفا کا مزار کیوں نہ رہے	7	//
163	راہ پر لا نہ سکی گردشِ ایّام مجھے	12	//
164	دن گزرتا ہے شب آتی ہے سحر ہوتی ہے	9	//
165	نہ اب اہلِ دل ہیں نہ اب دردوالے	10	//
166	موت سو بار آئے خاطر میں نہ لانا چاہیے	15	//
167	ظالم مری نظر میں محبت کا زہر ہے	5	//
168	شباب نام ہے غفلت کی نیند آنے کا	9	//
169	بھری دنیا پہ جب ڈالی نگاہ آخری میں نے	13	//
170	اسے کیا ہو دماغِ خاکساری	8	//
171	کعبہ و دیر سے پیام آئے	6	//
172	کہہ چکے سب کہہ کے اب کیا کیجئے	7	//
173	محبت میں محبت کے تقاضے بھول جاتے ہیں	8	//
174	میرے دل میں جو دل تمھارا ہو	11	//
175	محبت کم نگاہوں کو نظر میں لا نہیں سکتی	16	//

شمار	مطلع	تعداد شعر	غیر مطبوعہ
176	نور ہے کہ ظلمت ہے عشق کی بلا جانے	12	//
177	ہر ایک دوست کو دشمن کو میں پکار آیا	11	//
178	عفت قلب کے سوا کچھ بھی نہ تھا گناہِ عشق	8	//
179	مرے شعر نشتر نشاں اور بھی ہیں	7	//
180	اٹھوں گا زندۂ جاوید ہو کر بزمِ امکاں سے	12	//
181	جنھیں تم نے خلافِ وقت سمجھا بے محل جانا	7	//
182	مسکرا ہٹیں سیکھیں قہر کی نگاہوں سے	10	//
183	زحمت کریں نہ میرے لئے جلوہ گاہ سے	13	//
184	روئے فرزانگی سیاہ کریں	7	//
185	ختم دم بھر میں کارِ ہستی ہے	7	//
186	رازِ ہستی ہے مبتلا ہونا	6	//
187	اس کی دنیا کو بُرا کہتا ہے کیا کیا کوئی	17	//
188	دل میں رکھ مال جو دل خواہ نہیں	7	//
189	مسافر ہوں مگر کیا زندگی پر حکمرانی ہے	8	//
190	کسے غرض تھی جو ہو کی فضا میں جا ملتا	7	//
191	اسی کے دم قدم سے ہے یہ شانِ رہبری اپنی	7	//
192	دیکھوں تو راہِ غم میں کوئی ہم رکاب ہے	13	//
193	فریضۂ غم الفت نہ کیوں ادا کرتے	17	//
194	تدبیر اگر فاتحِ تقدیر نہیں ہے	17	//
195	جیسے میں اگلے قدموں رستہ سے پھر چلوں گا	9	//

مطبوعہ غزلیات

1

مرا دل ہے نقشِ دوامِ محبت
مری ہر نظر ہے پیامِ محبت

محبت کا مفہوم سمجھو نہ سمجھو
سنا ہوگا تم نے بھی نامِ محبت

بہت کوششیں کیں حریفوں نے اب تک
بگڑنے نہ پایا نظامِ محبت

دو عالم جسے محترم جانتے ہیں
کیا اس نے خود احترامِ محبت

بڑی اس کی قسمت میسّر ہو جس کو
دعائے محبت سلامِ محبت

مرے واسطے عہدِ مجنوں سے اب تک
امانت رہے صبح و شامِ محبت

یہ اے تجمّ تم حق پرستوں سے کہہ دو
مبارک ہو سودائے خامِ محبت

2

کفرِ نعمت ہے غمِ عشق میں فریاد نہ کر
زیست کی شان یہ ہے موت کو بھی یاد نہ کر

دل کی وسعت ہی تمنا کے لیے ہے لیکن
ہمتِ دل سے جو کم ہو اُسے آباد نہ کر

آج کچھ اور ہیں تیور مرے دردِ دل کے
عرض کرنا ہے تو کر آج کچھ ارشاد نہ کر

عزمِ محکم ہو تو گر گر کر سنبھلتا ہے بشر
راہِ تدبیر میں اندیشۂ افتاد نہ کر

دلِ خود دار کی توہین ہے اے دردِ ستم
کون کم ظرف یہ کہتا ہے کہ بیداد نہ کر

ان کی آنکھوں میں ہے رقصاں ابھی پندارِ ستم
مجھ سے کہتے ہیں کہ گزرے ہوئے دن یاد نہ کر

ایک دن ایک گھڑی ایک نفس کی مہلت
غمِ دنیا سے جو مل جائے تو برباد نہ کر

زورِ تخیّل سے پیدا ہی نہ ہو شکلِ عمل
فکرِ آزاد کو اتنا بھی اب آزاد نہ کر

3

مست وہ عیش میں ہیں غم سے گرانبار ہیں ہم
سونیوالوں کو خبر کیا ہے کہ بیدار ہیں ہم

حسن کا زعمِ نظر عشق کا معیار ہیں ہم
سب نے لوٹا ہے ہمیں اہلِ گہر یار ہیں ہم

نہ تو مرنے کے نہ جینے کے سزاوار ہیں ہم
آپ کی مشقِ ستم کے لیے درکار ہیں ہم

نہ محبت کے نہ دولت کے طلب گار ہیں ہم
کم سے کم عزتِ انساں کے تو حقدار ہیں ہم

ہم نے تاریک زمانوں کو دکھائے ہیں چراغ
کلمۂ کُن کی قسم مطلعِ انوار ہیں ہم

اتفاقات کے بل پر یہ رعونت یہ غرور
پھر کہو آنکھ ملا کر کہ روا دار ہیں ہم

در زنداں سے بھی دنیا کو سبق دیتے ہیں
فکر آزاد ہے جس کی وہ گرفتار ہیں ہم

اپنے مستقبلِ روشن کی خبر دینے کو
ماضی و حال کے مٹتے ہوئے آثار ہیں ہم

دوش پر ہم نے اٹھا رکھا ہے کونین کا بار
کون کہتا ہے زمانے کے لیے بار ہیں ہم

بے تحاشہ ہمیں دعویٰ نہیں آزادی کا
آدمیت کے شکنجے میں گرفتار ہیں ہم

فیصلہ دورِ تشدد کا بھی ہو گا اک دن
جو اٹھا رکھی ہے فطرت نے وہ تلوار ہیں ہم

ہر فضا میں ہمیں رہنا ہے نمایاں ہو کر
آج سردار نہیں ہیں تو سرِ دار ہیں ہم

ہم نے دنیا سے بگاڑی ہے بہت حق کے لیے
حرفِ حق ہے جو بغاوت تو گنہگار ہیں ہم

بات کہنا ہے ترے عہد میں کتنا مشکل
کچھ نہ کہنے پہ بھی ہر وقت گنہگار ہیں ہم

ہم کو معلوم ہیں آئین محبت کی حدود
بے نیازِ روشِ صبح و زُنّار ہیں ہم

سلح مقصود اگر ہے تو یہ جھگڑا کیوں ہو
تم گنہگار نہیں خیر گنہگار ہیں ہم

جمؔ اس عہد میں بے قدر ہے کیوں جنسِ وفا
کوئی اتنا نہیں کہتا کہ خریدار ہیں ہم

4

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور
مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور

ہر جادۂ منزل میں ہے سجدے کی ادا اور
معبد کی فضا اور ہے مقتل کی فضا اور

پھر ٹھہر گیا قافلۂ درد سُنا ہے
شاید کوئی رستہ میں مری طرح گرا اور

اک جرعۂ آخر کی کمی رہ گئی آخر
جتنی وہ پلاتے گئے آنکھوں نے کہا اور

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقدیر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور

اللہ گلہ کر کے میں پچھتایا ہوں کیا کیا
جب ختم ہوئی بات کہیں اس نے کہا اور

کتنے بھی ہوں کشتے مرضِ حرص و ہوا کے
بیمار کی موت اور ہے مرگِ شہدا اور

کیا زیرِلب اے دوست ہے اظہارِ جسارت
حق ہو کہ وہ ناحق ہو ذرا لے تو بڑھا اور

یہ وہم سا ہوتا ہے مجھے دیکھ کے ان کو
سیرت کا خدا اور ہے صورت کا خدا اور

دولت کا تو پہلے ہی گنہگار تھا مُنعم
دولت کی محبت نے گنہگار کیا اور

یہ دَور جو اے نجم ہے اردو کا مخالف
اس دور میں اردو کی ہوئی نشو ونما اور

5

مری نظر میں نہ معیارِ صبح و شام آیا
تڑپ گیا میں جب اس کا زباں پہ نام آیا

اسے بھی بھر ہی دیا جب اجل کا جام آیا
کہاں کہاں یہ متاعِ حیات کام آیا

عجب نہیں مرے عفوِ خطا کی صورت ہو
سزا کے واسطے میں ایسا تیز گام آیا

یہ لوگ حضرتِ واعظ کو بھولنے کے نہیں
جو میکشوں میں کبھی وقتِ فیضِ عام آیا

ستم شعاروں کے ہاتھوں ہزاروں ظلم سہے
خیال میں بھی نہ احساسِ انتقام آیا

جو پی کے آئے تھے نشے اتر گئے ان کے
میں اُٹھ کے جب درِ ساقی سے تشنہ کام آیا

فرشتے رہ گئے خاموش فرطِ حیرت سے
وہ راہِ عشق میں انسان کا مقام آیا

شہیدِ عشق وہاں خود پہنچ چکا تھا مگر
برسمِ دہر اُدھر سے اِدھر سلام آیا

کوئی تو دردِ محبت کا چارہ گر ہو گا
ہزار بار یہ دل میں خیالِ خام آیا

ہُوا جو ذکر محبت کے درد مندوں کا
ہمارا نام بھی شاید برائے نام آیا

سُخن طرازوں میں تنقید کی غرض سے سہی
کلامِ نجم کا بھی ذکرِ لا کلام آیا

6

خدا کی یاد کو بھی میکدہ میں آنا تھا
ہمیں بھی اپنا مصلا الگ بچھانا تھا

بھری بہار تھی پھولوں میں آشیانہ تھا
میں سوچتا ہوں حقیقت تھی یا فسانہ تھا

کہا یہ کس نے ہمارا بھی اک زمانہ تھا
یہ بات کر کے کچھ اپنا ہی دل دُکھانا تھا

پیامِ حق تہِ تیغِ ستم سنانا تھا
یہ وار بھی دلِ قاتل پہ کر کے جانا تھا

چمن پہ روپ، نشیمن میں دلکشی نہ سہی
گری ہے برق تو موسم بڑا سہانا تھا

نگاہ پھیر لی فطرت نے حسن دے کے فقط
بغیر عشق تمھیں آدمی بنانا تھا

اجل نے کی ہے وہ عجلت کہ سانس لے نہ سکے
ذرا حیاتِ دو روزہ پہ مسکرانا تھا

نہ غم کو تھی نہ حوادث کو دشمنی مجھ سے
کبھی کبھی مرے احساس کو جگانا تھا

خدا کو میں نے بفیضانِ عشق مان لیا
خرد زدوں کو دلائل میں سر کھپانا تھا

گناہ نشر کیے اس کے خوب واعظ نے
خدا کی راہ میں جس جس کا دل دکھانا تھا

ملال کس کو ہے دشمن نہیں وہ دوست سہی
مجھے کسی نہ کسی سے فریب کھانا تھا

قدم قدم پہ خطا کی ہے ابن آدم ہوں
نئے گناہ مگر سلسلہ پُرانا تھا

جو ہار بیٹھے تھے ہمت وہ اب کدھر جاتے
خیال و خواب کی منزل ہی اک ٹھکانا تھا

رہِ وفا میں بڑا بول کوئی کیوں بولے
کہاں گئے وہ جنھیں میرے ساتھ آنا تھا

میں نجمؔ حال کا مفہوم ہی سمجھ نہ سکا
مری نظر میں گزرتا ہوا زمانہ تھا

7

سچ ہے کہ وہ قریب رگِ جاں ضرور تھا
پاسِ ادب سے میں ہی ذرا دور دور تھا

سجدے میں کل کسی کا سرِ پُر غرور تھا
دن پھر گئے تو ردِ عمل بھی ضرور تھا

مارا ہے کس کے داؤں نے دنیا سے کیا کہوں
میں دوست سے قریب تھا دشمن سے دور تھا

آنکھوں نے جان ڈال کے دل رکھ دیا تھا نام
دل کیا تھا میرے ذوقِ نظر کا شعور تھا

سنتا ہوں منتظر تھیں ہزاروں حقیقتیں
میں عشرتِ خیال کے نشہ میں چور تھا

سہو و خطا ودیعتِ فطرت سہی مگر
کہنا یہی پڑے گا ہمارا قصور تھا

اٹھیں جو اَب کی بار قیامت ہی بن کے ہم
جینے کے واسطے ہمیں مرنا ضرور تھا

یہ گت بنا کے جاؤں میں کیا اس کے سامنے
تخلیقِ کائنات پہ جس کو غرور تھا

سب اقتدار ملتے ہی مصرف میں آگیا
کم ظرف کے دماغ میں جتنا فتور تھا

کیا رنگ و روپ آیا ہے کافر کے حسن پر
کتنا مری نگاہِ محبت میں نور تھا

عرفانِ نفس تھا جنھیں ان کا سکوں نہ پوچھ
میں کم نصیب اپنی حقیقت سے دور تھا

8

کسی دن داغِ گمراہی رہے گا ان کے سر ہو کر
جو اپنی راہ چلتے ہیں ہمارے راہ بر ہو کر

بضاعت کیا رہے گی مصرفِ نقد و نظر ہو کر
غنیمت ہے جو کوئی عیب رہ جائے ہنر ہو کر

نئی قیدیں بڑھیں منت گزارِ بال و پر ہو کر
دوائے دردِ دل آئی عذابِ دردِ سر ہو کر

سکوں حاصل ہے مجھ کو بندگی میں بھی محبت کی
تمھیں راحت نہیں ملتی خدائے سیم و زر ہو کر

ہزاروں قہقہوں میں گم نہ ہو جائے صدا میری
اکیلا کیا کروں انسانیت پر نوحہ گر ہو کر

وہ کیا جانیں کہ تیور اور ہیں اب جذبۂ دل کے
یہ سمجھے ہیں کہ رہ جائے گا کچھ دن شور شر ہو کر

دیا کرتا ہے انساں اپنے دل کو بھی فریب ایسا
خبر سب کچھ ہے اور بیٹھے ہوئے ہو بے خبر ہو کر

نہ پوچھو دہر میں کچلی گئی ہے زندگی کتنی
کہیں بید ست و پا ہو کر کہیں بے بال و پر ہو کر

کبھی عزم و عمل کی طاقتوں میں خم نہیں آیا
دکھائی آنکھ دنیا نے بہت زیر و زبر ہو کر

خدا معلوم دل سے کیا جوابِ تلخ ملتا ہے
محبت کا پیام آیا ہے محرومِ اثر ہو کر

نظر آئے ہمیشہ عیب اوروں کے ہنر اپنے
نگاہوں نے دغا دی عارفِ عیب و ہنر ہو کر

دلِ پُر درد کو بے درد دنیا کیا سمجھتی ہے
سہے گا وار تنہا امنِ عالم کی سپر ہو کر

زمانہ ہو چکا باطل کی افسانہ طرازی کا
حقیقت رنگ لائی ہے نوائے کارگر ہو کر

ابل ہو گی وہ کیسی جینے والے سوچتے ہوں گے
ابل کو ڈھونڈتا ہوں زندگی سے بہرہ ور ہو کر

نہ عزمِ آہنی تھا جن کی قسمت میں نہ منزل تھی
پڑے ہیں رہ گزر پر کشتگانِ سیم و زر ہو کر

حریفوں کو مبارک ہو برائے نام آزادی
یہ آئی ہے انھیں کے گھر حیاتِ مختصر ہو کر

ہنر مندوں کا آپس میں حسد اے جمؔ کیا معنی
ہنر سے دشمنی رکھتے ہیں یہ اہلِ ہنر ہو کر

9

احساسِ التجا بھی نہیں التجا کے بعد
اللہ کیا سکون ملا ہے دعا کے بعد

حاصل ہوا یہ سعیِ دلِ مبتلا کے بعد
اے دوست پھر زوال ہے نشو و نما کے بعد

تقدیر اُس کی جس کو یہ منزل نصیب ہو
اک شکر کا مقام ہے صبر و رضا کے بعد

کیا اقتضاء ہے تیرے کرم کا یہ ہے سوال
یہ میں بھی جانتا ہوں سزا ہے خطا کے بعد

رندوں میں اور بڑھ گیا رحمت کا اعتبار
واعظ ترے بیانِ عذابِ خدا کے بعد

نظریں ہماری جوہرِ قابل ہیں یا نہیں
دیکھیں گے ایک جلوۂ ہوش آزما کے بعد

کتنا خدا سے قرب کچھ اہلِ وفا کو ہے
کس کس کی یاد آئی ہے یادِ خدا کے بعد

غم کی فضا میں کوئی نہ آیا بروئے کار
دل بجھ گئے ترے دلِ درد آشنا کے بعد

انجام سعیٔ فکر و عمل کا خدا پہ چھوڑ
امید ہی خبر کی نہ رکھ مبتدا کے بعد

دنیا رسا ہو تا بہ حقیقت مجال ہے
لوٹی ہے پچھلے پاؤں ہر اک ارتقاء کے بعد

دیکھا ہے کس نے چہرۂ ہستی پہ رنگ و روپ
اہلِ وفا سے پہلے اور اہلِ وفا کے بعد

اک مشتِ خاک ہی سہی نسبت تو دیکھیے
کونین میں مقامِ بشر ہے خدا کے بعد

کوشش تو حجمِ دولتِ دنیا نے کی بہت
بھولے سے بھی نعم نہ کہا میں نے لا کے بعد

10

ہر ایک دوست کو دشمن کو میں پکار آیا
کسے زبانِ محبت کا اعتبار آیا

فضائے شوق میں جو اپنے جی کو مار آیا
حیات و موت کی سرحد پہ رُستگار آیا

غرورِ عشق میں سر نذر کر دیا میں نے
نگاہِ ناز کا اک قرض تھا اُتار آیا

خود اپنے حسنِ طبیعت کا عیش کیا کم تھا
خیال میں نہ کبھی عیشِ روزگار آیا

رہِ طلب میں بڑی روک تھام تھی لیکن
قدم بڑھا دیے جس نے وہ ہاتھ مار آیا

شریکِ حال تھی عہدِ خزاں میں خود داری
زبان پر بھی نہ افسانۂ بہار آیا

نہ جانے کس کو پکارا تھا اس کی رحمت نے
تڑپ کے میں نے صدا دی گنہگار آیا

نئے نئے جو سنے ہر فضا میں نام اس کے
بغیر نام کے ہی میں اُسے پکار آیا

گیا تصورِ حق تہ ملی نہ باطل کی
مرے خدا، میں بہت ہاتھ پاؤں مار آیا

کسی نے اپنی محبت کا تذکرہ جو کیا
مجھے بھی یاد مرا خوابِ خوشگوار آیا

یہ اور بات ہے ہم خود چمن میں رہ نہ سکیں
خدا، کا شکر زمانہ تو پُر بہار آیا

کبھی مزاج ٹٹولا نہ عصرِ حاضر کا
خیال عہدِ گذشتہ ہزار بار آیا

لگا کے تجمّ محبت میں آخری بازی　　شعورِ فکر و نظر کی رقم بھی ہار آیا

11

جو اپنے دل کے طلاطم کا ترجماں ہوتا　　زباں پہ جس کی ہے نغمہ وہ نوحہ خواں ہوتا
حریفِ عزم نہ ہوتی جو پستیٔ ہمّت　　نہ جانے کتنی بلندی پہ آشیاں ہوتا
کبھی تو جا کے خدائی سے بندگی ملتی　　بُرا ہی کیا تھا جو سجدہ نہ درمیاں ہوتا
تمہارے ذوقِ تکلّم کا یہ تقاضہ ہے　　تمھاری بزم میں ہر شخص بے زباں ہوتا
مزاج پوچھ لیا میں نے راہِ مسجد میں　　جنابِ شیخ سے پھر سامنا کہاں ہوتا
گزر رہے ہیں محبت میں دن غنیمت ہے　　مزاج کرتے جو کوئی مزاج داں ہوتا
گناہ اور ہے جبرِ گناہ ہے کچھ اور　　جومعترض ہے وہ اے کاش نکتہ داں ہوتا
بہار آئی تھی کچھ زخمِ دل ہرے ہوتے　　یہ سوز و ساز کا موسم نہ رائیگاں ہوتا
بُرا کہا مجھے دشمن نے خیریت گزری　　زبان دوست کا اک حرف بھی گراں ہوتا
شریکِ حال نہ ہوتی جو تجمّ خود داری　　ہمارے غم کا فسانہ غمِ جہاں ہوتا

12

نہ پوچھئے غمِ دوراں میں کیا اثر دیکھا　　خود اپنے حال پہ کس کس کو نوحہ گر دیکھا
منازلِ غمِ ہستی کو عمر بھر دیکھا　　مآل یہ ہے کہ جیسے بیک نظر دیکھا
مزاجِ دوست نے بھولے سے جب اِدھر دیکھا　　نگاہِ شوق میں اک حسن جلوہ گر دیکھا
رہِ رضا میں سہارے بغیر چل نہ سکے　　بڑے بڑوں نے مرا ہاتھ چھوڑ کر دیکھا
کچھ ایسے نقش مری خستگی نے چھوڑے ہیں　　غرورِ حسن بھی تھرّا گیا جدھر دیکھا
گناہگاروں کے اتنے بڑے سے مجمع میں　　خدا کا شکر مجھے اس نے اک نظر دیکھا
قصیدے جن کی زبانوں پہ دردِ دل کے رہے　　انھیں بھی ہم نے گرفتارِ دردِ سر دیکھا
خدا بھلا کرے احباب کی نگاہوں کا　　ہمارا حال تھا نا دیدنی مگر دیکھا
عمل کی حد میں وفا کا بڑا مقام سہی　　بیاضِ عشق میں اک حرفِ مختصر دیکھا
اسے بھی خلقتِ انسانیت پہ ناز ہوا　　جب اس نے کون و مکاں دیکھ کر اِدھر دیکھا

ملا جو عیب کہیں ہم نے چشم پوشی کی ہنر جہاں نظر آیا بصد نظر دیکھا
مجھے انیسؔ کی عظمت پہ رحم آیا نجمؔ وہ رنگ چہرہ یومِ انیسؔ پر دیکھا

13

زمانے کی فضا میں انقلاب آنے سے کیا ہوگا نہ بدلے گا یہ دل دنیا بدل جانے سے کیا ہوگا
کبھی جھوٹی تسلّی سے کسی کی پیاس بجھتی ہے ہمیں سمجھائیں اپنے دل کو سمجھانے سے کیا ہوگا
انہیں پھیلے ہوئے ہاتھوں کو سرگرم عمل کر دو اندھیرے میں خطِ تقدیر پڑھوانے سے کیا ہوگا
کوئی تدبیر کیجے میں نہیں تقدیر کا قائل مری حالت پہ لفظوں میں ترس کھانے سے کیا ہوگا
بحمد اللہ محفل کی فضا میں نے بدل ڈالی اٹھا دو اب مجھے اب میرے اٹھ جانے سے کیا ہوگا
ملے گی کچھ نہ کچھ دیوانگی ہر مردِ میداں میں یہی کہتی رہے دنیا کہ دیوانے سے کیا ہوگا
نگاہِ خشمگیں دعوت نہ بن جائے تبسم کی ہم ایسے من چلوں پر آگ برسانے سے کیا ہوگا
خدا رکھے یہی زندہ دلی ہوگی سواب بھی ہے گئی گزری جوانی کے پلٹ آنے سے کیا ہوگا
نشیمن میں بھی رہ جائے قفس کا دردِ سر شاید رہا ہو کر گلستاں کی ہوا کھانے سے کیا ہوگا
قصیدہ عرض کیجے نجمؔ شانِ حسن میں کوئی وہ کہتے ہیں غزل ارشاد فرمانے سے کیا ہوگا

14

دے کے دل، میں بے قرار دیکھتا چلا گیا اپنے غم کا شاہکار دیکھتا چلا گیا
اس کو راہِ عشق پر لے کے آئے بھی تو کیا اپنے حسن کی بہار دیکھتا چلا گیا
چھیننے کی چیز تھا اک میرا عزمِ مستقل انقلاب روزگار دیکھتا چلا گیا
موت نے اُتار لی جب نقابِ زندگی زندگی کا پردہ دار دیکھتا چلا گی
کیا ضرور تھا کہ وہ غم کی بات پوچھ لے دو جہاں کا غم نثار دیکھتا چلا گیا
کائناتِ حسن تھی آئینہ در آئینہ میں بہار در بہار دیکھتا چلا گیا
آئیں گے ضرور وہ ان سے یوں کہے کوئی ان کی راہ جاں نثار دیکھتا چلا گیا
زندگی بھی خواب تھا اے خوابِ زندگی خوشگوار و ناگوار دیکھتا چلا گیا
پھر خمارِ غم ہوا غم کو پھر نظر لگی پھر مجھے ستم شعار دیکھتا چلا گیا

آہ کر رہا تھا جو سانس بھی نہ لے سکا　　فیضِ جبر واختیار دیکھتا چلا گیا
عید ہی سہی مگر میکدے میں ہم نہ تھے　　حجمؔ ابرِ نو بہار دیکھتا چلا گیا

15

کھل گیا جامۂ ہستی کا گراں ہو جانا　　دیکھیں اس بزم سے اٹھیں تو کہاں ہو جانا
جان لیوا ہے ترا جانِ جہاں ہو جانا　　کس وناکس کے قریبِ رگ جاں ہو جانا
ساتھ دوگے مرا تم بھی کو زبانی ہی سہی　　حق کو اک روز ہے جاری بزباں ہو جانا
دل کا آئینہ سلامت مجھے منظور نہیں　　آئینہ دیکھ کے دم بھر کو جواں ہو جانا
اس سے کیا صبر کے معیار میں فرق آتا ہے　　عظمتِ غم سے مرا اشک فشاں ہو جانا
ہائے وہ مجھ پہ زمانے کی نگاہِ تنقید　　ہائے وہ اپنی ہی نظروں سے نہاں ہوجانا
کہیں ان آنکھوں سے جاتی ہے حقائق پہ نظر　　دل کو خود چاہیے چشمِ نگراں ہو جانا
وقت آنے پہ مجھے دوست بنانا ہی پڑا　　راس آیا نہ انھیں دشمنِ جاں ہو جانا
کیسا میدانِ عمل دیکھ کے دل بیٹھ گیا　　کیسا آساں تھا ارادوں کا بیاں ہو جانا
دولت وعلم کی منزل میں ہُوا ہے اکثر　　اپنی ہستی پہ کوئی اور گماں ہو جانا
اپنے اوہام کو الہام سمجھنے والے　　کچھ ہنسی کھیل ہے کیا حق بزباں ہو جانا
عشق ایثار کا وہ نقطۂ آخر ہے جہاں　　زندگی میں ہے فراقِ تن وجاں ہو جانا
کیسی حسرت سے مری بےعملی نے دیکھا　　کتنی دل سوز امیدوں کا دھواں ہو جانا
حجمؔ بہتر ہے تصنّع کی دل آویزی سے　　تلخ لہجہ میں حقیقت کا بیاں ہو جانا

16

خوابِ خوش کہنے ہی کو اپنا تھا اپنا کچھ نہ تھا　　حرفِ آزادی سنا تھا ہم نے سمجھا کچھ نہ تھا
کون کہتا ہے کہ دنیا میں ہمارا کچھ نہ تھا　　جب تک اپنے فرض کا احساس تھا کیا کچھ نہ تھا
ہاتھ خالی اپنی منزل سے چلا سوئے عدم　　اے مسافر کچھ ترے قبضہ میں تھا یا کچھ نہ تھا
بات کہنے کی نہیں لیکن حقیقت ہے یہی　　میری ہستی سے جو سب کچھ ہے وہ تنہا کچھ نہ تھا
ان کی اک کروٹ پہ ہو جاتی ہے دنیا مضطرب　　میں تڑپتا تھا مگر میرا تڑپنا کچھ نہ تھا

پُرسکوں تھی میرے دل کی طرح مسجد کی فضا — کتنے فتنے آج اٹھے ہیں کل یہ جھگڑا کچھ نہ تھا
دامنِ دولت تھا جب تک دامنِ اغیار میں — آپ بھی تھے ہم بھی تھے یہ میرا تیرا کچھ نہ تھا
رحم کے قابل ہے اس کا عالمِ بے چارگی — کہہ دیا جس نے بہت کچھ اور سوچا کچھ نہ تھا
ہم کو کس کس نے نہ سکھلائے طریقے صبر کے — اپنے اوپر وقت جب آیا طریقہ کچھ نہ تھا
اعترافِ معصیت تھی میکشی کے ساتھ ساتھ — میکدے میں نازِ تسبیح و مصلا کچھ نہ تھا
سو ارادے تھے عمل کے حوصلہ کو کیا کریں — اب تو کہنے کے لیے ان کا ارادہ کچھ نہ تھا
فطرتِ انساں پہ جب تک عشق تھا پَرتو فگن — جوہرِ انسانیت کو نجم خطرہ کچھ نہ تھا

17

پھر نہ اٹھا کوئی فتنہ حشر ہو جانے کے بعد — رہ گئی خاموش دنیا میرے افسانے کے بعد
وہ تسلی دینے آئے ہیں ستم ڈھانے کے بعد — کیا کروں گا اب یہ تحفہ گھر ہی لٹ جانے کے بعد
اس بھری دنیا میں اک انساں نظر آتا نہیں — زعم کتنا بڑھ گیا انسان کہلانے کے بعد
میکدے میں مجھ پہ جو ہنستے ہیں ان کو کیا خبر — کتنے پیمانے اٹھیں گے میرے پیمانے کے بعد
میری پیشانی پہ اک بل بھی نہ آئے گا نظر — دیکھنا میری طرف دنیا بدل جانے کے بعد
کھل گئی تیری زباں ذوقِ سماعت اب کہاں — کیا کہے کوئی ترے ارشاد فرمانے کے بعد
کانپ اٹھا میں دیکھ کر دردِ محبت کا اثر — رو دیا وہ سنگدل بھی مجھ کو سمجھانے کے بعد
تم کہاں تک جاگ سکتے ہو سحر ہونے کو ہے — شمعِ محفل کو بھی نیند آتی ہے پروانے کے بعد
بجلیوں کی شوخیوں کو ایک مصرف چاہیے — آپ کا عشرت کدہ ہے میرے ویرانے کے بعد
رنگِ محفل اب کسی فنکار کے بس کا نہیں — دیکھیے کیا ہو مجھے محفل سے اُٹھوانے کے بعد
خاک ہو کر ہم نشیں اکسیر ہونا ہے مجھے — کیا کہیں راحت ملے گی خاک ہو جانے کے بعد
رنگ لائیں گی غلط سرمستیاں ہر دور میں — لٹتا جائے گا یونہی میخانہ میخانے کے بعد
نجم فکرِ دُب میں اک حرفِ آخر اور ہے — ہم ٹھہرنے کے نہیں پیغام پہنچانے کے بعد

18

جنوں کا جوش دکھا لالہ زار پیدا کر — خزاں کا چیر کے سینہ بہار پیدا کر

سُبک خرامیِ برق و شرار پیدا کر — جو رہ گزار نہ ہو رہ گزار پیدا کر
فضا مخالفِ سرمایہ دار پیدا کر — دلِ غریب محبت شعار پیدا کر
قدیم زاویۂ فکر سے جہاں کو نہ دیکھ — نظر مناسبِ لیل ونہار پیدا کر
غرورِ بندگی و ہوشِ بندگی کب تک — جبیں سے سجدۂ مستانہ وار پیدا کر
نگاہِ ناز کی یہ سرد مہریاں توبہ — نگاہِ شوق سے برق و شرار پیدا کر
نئی حیات ہو عہدِ حیات کا حاصل — اس ابتدا سے یہ انجام کار پیدا کر
تصورات کے نقش و نگار کیا ہوں گے — تصرّفات میں نقش و نگار پیدا کر
غرورِ ظلم لرز جائے جس سے ٹکرا کے — سکون و صبر کا وہ کوہسار پیدا کر
نظر سے عجز نہ جھلکے زباں پہ آہ نہ ہو — فضائے جبر سے یہ اختیار پیدا کر
ہزار رنج اُٹھا لے یہ بارِ غم نہ اٹھا — نہ بھول کر بھی کوئی غمگسار پیدا کر
جہانِ عشق میں جس کو کبھی زوال نہ ہو — کمالِ غم سے وہ نصف النہار پیدا کر
جو بڑھتے بڑھتے اک احساسِ کمتری بن جائے — نہ اس طرح کا غمِ انکسار پیدا کر
مجھے ہو فتح کیا امید اس کو بیم وشکست — دلِ حریف میں بھی اعتبار پیدا کر
وہ جنگ کی کہ اب زخم پر ہنسی بھی نہ ہو — کوئی مقابلۂ خوشگوار پیدا کر
حکومتوں کے بھی جھک جائیں سر ترے آگے — وہ دل وہ حوصلۂ اقتدار پیدا کر
جو پھانس بن کے رگِ دل کی روح کہلائے — کہیں سے وہ خلش ساز گار پیدا کر
گلہ ہو شکر ہو تقریر ہو کہ شعر ہو نجم — یہ طول ٹھیک نہیں اختصار پیدا کر

19

پہنچیں گے نہ گمراہ تری راہ گزر تک — قسمت کے سکندر ہیں پلٹ آئیں جو گھر تک
کیا ذکر ہے نشہ کا تری بزم میں ساقی — چہرے بھی اُتر جائیں گے آثارِ سحر تک
کیوں آگئے تم ہر کس و ناکس کی نظر میں — کیا نور تھا رُخ پر مری پاکیزہ نظر تک
سُنتا ہوں کہ سیدھے ہیں بہت حضرتِ واعظ — دھوکے میں چلے آئے تھے میخانہ کے دَر تک
مارے گئے کچھ یوں بھی غمِ عشق کے رہرو — پہنچی نہ کسی قافلہ والے کو خبر تک

اُبھریں گے کبھی جادۂ تقدیس کے دھبّے
انسان فرشتہ ہی سہی نقد و نظر تک

ناکامِ ازل پوچھتا پھرتا ہے ہر اک سے
وہ کس کی دعا ہے جو پہنچتی ہے اثر تک

اک شب تو محبت کی عبادت میں گزر جائے
اللہ بچالے جو شبِ غم کی سحر تک

کرتے رہو تم تابہ قمر جانے کی کوشش
جانا ہے مجھے خالقِ صد شمس و قمر تک

ہم کیا ہیں میسر نہیں موسیٰ کو تکلّم
سنتے ہیں کہ بات آہی گئی ذوقِ نظر تک

کہہ دے کوئی واعظ سے کہ یہ سجدہ گزاری
محدود نہیں ہے طلبِ سجدہ و سر تک

اک پَل میں بھی ہے معرفتِ حُسن کا امکاں
وقفہ ہے بہت روشنیِ برق و شرر تک

اللہ رے اس کی نگہِ ناز کی قوت
کھینچی ہے لکیر ایک مرے دل سے جگر تک

کس کو ہے خبر مرحلے طے کتنے کیے ہیں
اک قطرۂ ناچیز نے تعمیر گُہر تک

دل اپنا جلاتا ہوں شبِ غم تو یہ غم ہے
یہ آگ پہنچ جائے نہ دامانِ سحر تک

اللہ میں کب سے پسِ دیوار پڑا ہوں
کتنی یہ کٹھن راہ ہے دیوار سے دَر تک

فرمودۂ غالبؔ کے موافق ہوں میں اے نجمؔ
جینے کا یقیں کس کو ہے آہوں کے اثر تک

20

سوئے اجل بھی جائیں گے اس کرّ و فر سے ہم
گیتی بھی تھرتھرائے گی گزرے جدھر سے ہم

آج اپنے ہی چمن میں ہیں بے بال و پر سے ہم
اللہ گھر میں رہ کے بھی باہر ہیں گھر سے ہم

میداں میں سر بلند تھے تیغ و تبر سے ہم
زنداں میں سر نہ پھوڑیں گے دیوار و در سے ہم

کیا جانے اتحاد ہو یا اور افتراق!
جس دن اُدھر سے آپ اٹھیں اور ادھر سے ہم

تم نے ہنر کو عیب سے بدتر بنادیا
کچھ عیب بھی کیا تو کریں گے ہنر سے ہم

بیگانہ دردِ سَر سے ہے وہ دردِ دل کجا
کھٹکا یہ ہے الجھ نہ پڑیں چارہ گر سے ہم

بخشا ہے ظرف دیکھ کے فطرت نے دردِ دل
لائے نہیں اٹھا کے کسی رہ گزر سے ہم

تاریکیوں میں روشنیاں پھیلتی گئیں
کتنے چراغ جَل گئے گزرے جدھر سے ہم

اُٹھ جائے روئے حسن سے پردہ حجاب کا
باتیں کریں گے عشق کے پیغامبر سے ہم

رات آگئی یہ بیچ میں کس تیرہ بخت کی
بیدار ہو چکے تھے پیامِ سحر سے ہم

راس آئیں شاید ان کو یہ ہنگامہ سازیاں
منزل کو جا رہے تھے اس شور و شر سے ہم

تم نے تو خوب راہ میں کانٹے بچھائے ہیں
بچ بچ کے چل رہے ہیں شعورِ نظر سے ہم

طوفان یہ تھمے تو ملے فرصتِ عمل
بیٹھے ہیں ہار مان کے فکر و نظر سے ہم

جینا ہمارا مرگِ مسلسل سے کم نہیں
اس حال میں بھی جیتے ہیں مرنے کے ڈر سے ہم

کیا بال و پر ہیں قوتِ پرواز کے بغیر
کس درجہ دیدہ زیب ہوئے بال و پر سے ہم

جوشِ عمل بڑھا بھی تو اتنی زباں کھلی
زنداں کوئی ملے تو بدلتے ہیں گھر سے ہم

وہ بھی ہیں چل پڑے جو ستاروں کی راہ پر
اور آپ چاہتے ہیں کہ باز آئیں سر سے ہم

کیا بیچ میں سے بات کٹی ہے نہ پوچھئے
کچھ کہہ رہے تھے زندگیٔ مختصر سے ہم

وحدت ہماری حاصلِ نوعِ بشر ہے نجمؔ
وابستہ ہیں جو دامنِ خیر البشرؐ سے ہم

21

حدِ گناہ میں آجاتی ہے نگاہ کبھی
بشر سے ہوتے ہیں کتنے گناہ نا معلوم

وہ اقتدار سہی ناگہاں نصیب نہ ہو
رہے گا دل پہ بھی کچھ اقتدار کیا معلوم

سنوارے اب کے نئے سر سے جب چمن فطرت
بہار کس کی ہو کس کی خزاں خدا معلوم

ٹھٹک کے رہ گئے نا آشنائے راہِ وفا
رُکے نہ وہ جنہیں اپنا مقام تھا معلوم

ہے بال بال گنہگار خود میں کہہ دوں گا
کریں گے جبرِ مشیت سے اور کیا معلوم

شعورِ خیر سے امکانِ شر ہُوا معلوم
خرد زدوں کو یہ قدرت کے کھیل کیا معلوم

بشر نے رازِ حقیقت کیا ہے کیا معلوم
تمام فکر و نظر اور تمام نا معلوم

بہت زمانے سے تھا ذوق کارفرمائی
چلو تمہارا بھی معیار ہوگیا معلوم

ہر آدمی سے میں حق بات کہتے ڈرتا ہوں
یہ حق ہوا ہے فرشتوں کو بھی بُرا معلوم

بہت سے ایسے فسانے تو سنتے آئے تھے
بدل ہی جائے گی دنیا یہ کس کو تھا معلوم

بچا ہوں وار سے دشمن کے بارہا لیکن
ابھی اجل کو ہیں رستے ہزارہا معلوم

جو دردِ عشق ترا حاصلِ حیات نہیں
سوال ہے تری ہستی جواب نا معلوم

غضب کیا مری آنکھوں میں ڈالدیں آنکھیں
پلائیں گے مجھے کتنی شراب کیا معلوم

کوئی حسینؑ کا ایثار مجسم کیا سمجھے
کسے ہے وسعتِ مفہوم کربلا معلوم

22

مجھے کرنا ہے کچھ پروانۂ آتش بجاں ہوکر
وہ شعلہ بن کے جلنا یا سلگنا ہو دھواں ہوکر

کہیں ہوتی ہے احسانوں کی گنتی مہرباں ہوکر
یہ باتیں دل میں رہتی ہیں حسابِ دوستاں ہوکر

گرا ہو سعیِ برحق میں صفِ ناتواں ہوکر
ضرورت ہے تو اٹھوں خاکِ مقتل سے جواں ہوکر

بہت اڑتے ہوئے دیکھے ہیں دامن دھجیاں ہوکر
یہ پروازِ تشدد رہ نہ جائے رائیگاں ہوکر

رہے صدیوں کسی کے در پہ سنگِ آستاں ہوکر
دماغ اب عرش پر ہیں امتیازِ جسم و جاں ہوکر

ہوئی ہو ابتداء جس کی عذابِ ناگہاں ہوکر
نہ جانے کیا بلا ہوگی وہ آزادی جواں ہوکر

کشش ہے خاک کی یا بے نیازی خاکساری کی
بہت سرکش اُتر آئے زمیں پر آسماں ہوکر

کوئی حق کا دھنی اٹھے تو باطل تھم نہیں سکتا
ہم اپنے حق سے خود بیٹھے ہوئے ہیں بدگماں ہوکر

زہے جوشِ عمل کچھ جینے والے کرلیے پیدا
وہ جذبہ کیا جو آخر رہ گیا انگڑائیاں ہوکر

سلامت ہمت منزل نہ دے گا ساتھ گر کوئی
اکیلا اپنے دم سے بڑھ چلوں گا کارواں ہوکر

گنہ کیا سر پہ لیتے آزماتے کس کی رحمت کو
خدا کے خوف نے جنبش نہ کی بارِ گراں ہوکر

امیدِ عافیت کیا کیا پھلی پھولی ارے توبہ
زمیں کانپی لہو برسا وہ گزرے ہیں جہاں ہوکر

اُلٹ پھیر اس کی قدرت کے سمجھ ہی میں نہیں آئے
بہار آئی دلیلِ اعتبارِ خزاں ہوکر

دلِ بیگانۂ ہمت کو یارب کیا کرے کوئی
جو پتھر بن کے ٹھیرا کاش اُڑ جاتا دھواں ہوکر

نہ ٹکر لے سکی کوئی مرے شوقِ شہادت سے
ہزاروں نعمتیں آئیں نصیبِ دشمناں ہوکر

عجب کیا دَم نکل جاتا جو کم ظرفوں کا سنتے ہی
نوید آتی اگر کوئی حیاتِ جاوداں ہوکر

گری جب آشیاں پر ہم نے تب بجلی کو پہچانا
ہزاروں بار گزری ہے قریبِ آشیاں ہوکر

یہ دن چڑھتا ہوا پھولوں کے یہ اُترے ہوئے چہرے
چمن میں کیا بہار آئی ہے تصویرِ خزاں ہوکر

23

بن گئی قوسِ قزح جب لے کے انگڑائی غزل
فکر کے ظلمت کدہ میں روشنی لائی غزل

فلسفۂ، منطق، سیاست، موعظہ، حکمت، حدیث
علم و فن کی ہر بلندی پر نظر آئی غزل

حمد و نعت و منقبت، نوحہ، قصیدہ، مرثیہ کتنے عالم اپنے دامن میں اٹھالائی غزل
رزم میں بھی کارفرما بزم میں بھی نغمہ کار نازشِ اسکندری و فخرِ دارائی غزل
جوہر فرہاد و مجنوں نَل دمن کا رنگ و روپ لذّتِ شیرینی و اندازِ لیلائی غزل
اللہ اللہ دامنِ پیغمبری تک دسترس رفعتِ فکرِ سلیماں بَن کے اترائی غزل
میؔر و غالبؔ کی غزل ہے نجم و ثاقبؔ کی غزل تجھ سے ارضِ تاج نے کی بزم آرائی غزل
زادۂ ایراں ہے تو پروردۂ ہندوستاں یہ دو عالم مانتے ہیں تیری یکتائی غزل
ابتدائے آفرینش سے یہی ہوتا رہا عشق نے آنسو بہائے حسن نے گائی غزل
مسکرائی فطرتِ غم درد نے تعظیم دی شاعرِ حساس کی رَگ رَگ میں لہرائی غزل
ہے یہاں روئے سخن حسنِ حقیقت کی طرف اہلِ ظاہر کے لیے ہے وجہ رسوائی غزل
لگ گئے تہذیب کی رنگینیوں میں چار چاند ہم نے اس دنیا کے جس گوشے میں پہنچائی غزل
حضرتِ سوؔدا الجھ کر شوخیوں میں رہ گئے میؔر صاحب کو بڑی کاوش سے ہاتھ آئی غزل
یہ غزل کو سب سے پہلا صاحبِ دیواں ہوا پاگئی لطفِ ولیؔ سے شانِ والائی غزل
کوئی اس کو اپنے منصب سے ہٹا سکتا نہیں آج تک تو کررہی ہے کارفرمائی غزل
نجم میرے ہموطن ہیں غالبؔ و میؔر و نظیؔر کیوں نہ کرتی میرے در پر ناصیہ سائی غزل

24

دلی جذبات کے برعکس یہ صورت گری کب تک بنامِ زندگی آخر فریبِ زندگی کب تک
رہے گا نا مکمل یہ نظامِ دلبری کب تک خدایا تیری دنیا میں محبت اجنبی کب تک
فقیر اللہ کے سمجھے ہوئے تھے اس حقیقت کو سرِ انساں پہ ٹھیرے گی کلاہِ خسروی کب تک
کسی دن یہ پہیلی بوجھنی ہے حضرتِ دل سے پرائی عقل میں نور اپنی دولت میں کمی کب تک
عمل کی راہ سے بھی ربط ہے کچھ عزمِ منزل کو خیال و خواب کے ماحول میں آوارگی کب تک
اجل کی نیند بھی میں سو گیا پھر چوکنا کیسا نہ جانے وقت کے احساس نے آواز دی کب تک
کبھی تو ایک سجدہ اس کا ہنستے کھیلتے کرلیں خدا کی یاد میں یہ بندگی بے چارگی کب تک
بہت میکش جہاں دو گھونٹ میں آپے سے باہر تھے کسے معلوم ہے ہم نے وہاں آنکھوں سے پی کب تک

نہ غش کی بے شعوری ہے نہ غفلت خوابِ راحت کی
شعورِ زیست میں یہ وقت کی غارت گری کب تک

سرِ منبر نظر تھی دل تھا سجدے میں محبت کے
خدا معلوم واعظ نے کہانی سی کہی کب تک

محبت کر رہی تھی درد کی پیغمبری کب سے
محبت سے بچاتا جان اپنی آدمی کب تک

فرشتہ ہوں کوئی جو درد سمجھوں گا نہ دشمن کا
بھلا انسان سے انسان کی بے گانگی کب تک

کبھی یہ سوچتا ہوں بحر میں اشعار پر اپنے
چڑھیں گی ان کی نظروں میں یہ آیاتِ جلی کب تک

25

آڑ ہے کعبہ کی سجدہ روئے جاناں کی طرف
فطرتاً انساں کا دل جھکتا ہے انساں کی طرف

جاؤں گا اس بزم میں نا خواندہ مہماں ہی سہی
غور سے دیکھیں گے وہ نا خواندہ مہماں کی طرف

ایک طوفانِ محبت ہوں میں رُکتا ہوں کہیں
کیا سمجھ کر انگلیاں اٹھتی ہیں طوفاں کی طرف

عیش کی راتیں مبارک دل جلاؤ یا چراغ
میں خطِ مشرق میں ہوں صبحِ درخشاں کی طرف

آئینہ کا سامنا ہوتے ہی تیور بنس دیے
کہہ دیا کیا دیکھ کر جاناں نے جاناں کی طرف

عزمِ خالص چاہیے تدبیرِ منزل کے لیے
پاؤں میداں کی طرف اٹھیں کہ زنداں کی طرف

سیکھ لے نا آشنا میری نظر سے اضطراب
موجِ رقصاں کی طرف آموجِ رقصاں کی طرف

وسعتِ ہمت سلامت رنجِ مشکل مل گیا
میں نے پہلو بھی نہ بدلا عیشِ آساں کی طرف

گرتی پڑتی آ رہی ہے جس طرف جاتے ہو تم
دیکھتے کیا ہو نگاہِ پابجولاں کی طرف

اے محبت رہنما بن اے وفا تقدیم کر
لے چلا ہوں آفتِ دل آفتِ جاں کی طرف

منہ اندھرے کس طرف دیکھوں شبِ غم دیکھنا
شمعِ گریاں کی طرف یا صبحِ خنداں کی طرف

پوچھنا تھا چھپنے والے سے جو مل جاتا کہیں
آپ ہندو کی طرف ہیں یا مسلماں کی طرف

آج کل سنتے ہیں بحرِ سخن پر ملتی ہے داد
یوں زمانہ رُخ نہیں کرتا غزل خواں کی طرف

26

لُٹ لُٹا کر تھا جو کچھ وہ بھی کہاں باقی رہا
میں اک اس کی بے نیازی کا نشاں باقی رہا

اس بہارِ جانستاں میں پوچھتا پھرتا ہوں میں
کیا چمن میں کوئی میرا ہم زباں باقی رہا

خاطی و باغی سہی اللہ کا بندہ تو ہوں
یہ تو رشتہ میرے اس کے درمیاں باقی رہا

جا و بیجا مدح کرنے تک وہ دشمن تھا مرا
عیب جوئی جب سے کی دشمن کہاں باقی رہا

ان کے آگے سب وفا کی داستاں گم ہوگئی
ہر زباں پر ایک حرفِ الاماں باقی رہا

جہل کی ضد پر زبانِ عقل و دانش تھم گئی
اک سکوتِ حق جوابِ جاہلاں باقی رہا

زندگی کے سب بلند آہنگ دعوے رہ گئے
زیرِ لب اک احتجاجِ ناتواں باقی رہا

میں نے یوں راہِ طلب کی سختیوں سے جنگ کی
میرا جذبہ کارواں در کارواں باقی رہا

ہم دکھا دیں گے تصرف ہو کسی معصوم کا
آدمیت کا اگر نام و نشاں باقی رہا

آج اُردوئے معلّٰی کی اشاعت کے لیے
یہ غنیمت ہے کہ نجمِ نکتہ داں باقی رہا

27

اس قدر شدتِ احساس میں ڈوبا ہوں میں
آہ دشمن بھی جو کرتا ہے تڑپتا ہوں میں

ہوں بُرا دیدۂ ہستی میں کہ اچھا ہوں میں
آج تک خالقِ ہستی کو گوارا ہوں میں

حل کیے میں نے ہزاروں ہی مسائل لیکن
سر پہ موت آگئی جب زیست کو سمجھا ہوں میں

عرصۂ حشر ہوئی جاتی ہے دنیا یارب
کوئی اتنا نہیں کہتا کہ شناسا ہوں میں

مجھ پہ اللہ کے بندوں ہی نے توڑے ہیں ستم
میں یہ کہتا رہا اللہ کا بندہ ہوں میں

ہمت آفزا ہو کوئی یہ مرا ماحول نہیں
آپ ہی اپنے ارادوں کا سہارا ہوں میں

میری بگڑی ہوئی رفتار پہ ہے ان کی نظر
ہوش اڑتے ہیں ذرا بھی جو سنبھلتا ہوں میں

اللہ اللہ یہ ہے میری بُرائی کا وقار
اچھے اچھوں کی نگاہوں میں کھٹکتا ہوں میں

زاہدِ خشک سمجھتے ہیں گنہگار مجھے
اور گنہگار سمجھتے ہیں فرشتہ ہوں میں

میکدہ میں مرے ساتھی بھی تھے ہمدرد بھی تھے
جب سے مسجد میں ٹھکانا ہے اکیلا ہوں میں

درسِ حکمت نے بتایا مجھے اک مُشتِ غبار
دل کی وسعت کا اشارہ ہے کہ دریا ہوں میں

خُود پرستی کو گنہگار سمجھنے والے
یہ نہ سمجھے کہ گنہگار خود اپنا ہوں میں

یہ نہ بھولے سے بھی سمجھا کوئی قسمت کا دھنی
اتفاقات کی دنیا کا نمونہ ہوں میں

ابھی دیکھا ہے کہاں ولولۂ صبروسکوں
کثرتِ غم نے یہ سمجھا ہے کہ تنہا ہوں میں

تجھ سا مظلوم زمانے میں نہ ہوگا کوئی
کارفرمائے محبت تن تنہا ہوں میں

یہ بھی اک حادثہ اردو کی محبت کا ہے نجمؔ
کنجِ عزلت سے جو باہر نکل آیا ہوں میں

28

کبھی یوں کہیں سر جھکانے چلے ہیں
جدھر ہم چلے آستانے چلے ہیں

ستائے ہوئے ہیں ستانے چلے ہیں
تہِ تیغ ہم مسکرانے چلے ہیں

کسی کی نظر میں سمانے چلے ہیں
جہاں دل نہیں دل بتانے چلے ہیں

وہ کہہ دیں جفا کو وفا کی کسوٹی
کہیں ایسے حیلے بہانے چلے ہیں

شبِ غم نہ ہوگی چراغوں سے روشن
یہ تارے کدھر جگمگانے چلے ہیں

کہاں کی قیامت قیامت یہی ہے
خطائیں ہیں کچھ بخشوانے چلے ہیں

وہ پہلے محبت کی صورت بنالیں
محبت کی باتیں بنانے چلے ہیں

لُبھاتے ہیں کیوں مجھ کو دنیا کے جلوے
مسافر سے کیا دل لگانے چلے ہیں

کہیں نامِ دوزخ سُن آئے ہیں واعظ
یہی آڑ لے کر ڈرانے چلے ہیں

نہ دیکھیں گے پھر کر مسافر عدم کے
یہ سب اپنے اپنے ٹھکانے چلے ہیں

چمن کے دُلارے تھے یہ غنچہ و گل
جو خوشبو سے کلیاں بسانے چلے ہیں

بگڑ کر قلمکارِ قسمت سے نجمؔی
محبت کی بگڑی بنانے چلے ہیں

29

پینگ ان سے بڑھ رہے ہیں وہ دل پہ چھا رہے ہیں
امید کی فضا میں جھولا جھلا رہے ہیں

بے خود ہے ساری محفل محفل پہ چھا رہے ہیں
خاموش ہیں زبانیں دل گنگنا رہے ہیں

آئیں تو سہی کہ میں ان کو زندگی بنالوں
جو میری موت بن کر تشریف لا رہے ہیں

جیسے میں اُلٹے قدموں رستہ سے پھر چلوں گا
راہِ وفا کے ذرّے آنکھیں دکھا رہے ہیں

دیکھی ہے ہم نے دنیا رازِ کرم نہ پوچھو
صبر آزما چکے اب جبر آزما رہے ہیں

کیا سانس اکھڑ رہی ہے کیا دم الٹ رہا ہے
ہم شامِ زندگی کا اک گیت گا رہے ہیں

اِک نقش آب و گِل کو جلوہ بنا دیا ہے
اے حسن کے تماشے ہم دل بڑھا رہے ہیں

کوئی خودی سمجھ لے یا بے خودی سمجھ لے
دنیا خراب کر کے اک گھر بنا رہے ہیں

میرے سکونِ غم پر اب حسن مضطرب ہے
خود داریوں کے صدقے جلوے بلا رہے ہیں

اُس عیش کے تصدق انسان بن گیا ہوں
زیرِ قدم فرشتے آنکھیں بچھا رہے ہیں

میں سوچتا تھا دل ہی اس سمت بڑھ رہا ہے
میں دیکھتا ہوں وہ بھی نزدیک آ رہے ہیں

اشکوں کی رَو میں تجمّی دل کا لہو بہا کر
غم کی نوازشوں کو رنگیں بنا رہے ہیں

30

کبھی چتون سے وضع کارفرمائی نہیں جاتی
فضائے درد میں بھی شانِ دارائی نہیں جاتی

بچا کر گوشۂ دامن گزر جا دورِ ہستی سے
لپٹ جاتی ہے دامن سے تو رسوائی نہیں جاتی

ہزاروں کارپردازانِ قدرت ہیں مگر پھر بھی
خدائے یکہ وتنہا کی یکتائی نہیں جاتی

سخنور کو ہے تنہائی میں بھی لطفِ غزل خوانی
مفکر ہو تو محفل میں بھی تنہائی نہیں جاتی

میسر ہے زمانہ بھر کی ہمدردی و دلچسپی
کسی منزل میں نادانوں کی دانائی نہیں جاتی

جھکا جاتا ہے اک انساں کے آگے بانیِ قدرت
غرورِ آدمیت کی جبیں سائی نہیں جاتی

وہی لفظوں کی خوش نظمی وہی ترتیب کے تیور
جنابِ تجمّ کی نظموں سے رعنائی نہیں جاتی

31

راہِ رضا میں کہیں مصرفِ گناہ نہیں
سفر طویل تھا دامن پہ گردِ راہ نہیں

براہِ راست یہ مانا کہ رسم و راہ نہیں
تری طرف تو ہے تجھ پر اگر نگاہ نہیں

خدا کا شکر ہے حالِ تباہ پر اپنے
تمہارے حدِ تصور تلک تباہ نہیں

شعورِ نطق سے میں اپنی ہی پناہ میں ہوں
پناہ ڈھونڈنے والوں ہی کو پناہ نہیں

اُٹھے جہاں سے تو ایسا بھی کفرِ نعمت کیا
تماشا ختم ہوا اور زباں پہ واہ نہیں

مبارک اہلِ حسد کو گناہِ بے لذت
گناہ بھی تو بہ اندازۂ گناہ نہیں

مری نگاہ نے کی دور دور کی تنقید
قریب ہوں مگر اپنی طرف نگاہ نہیں

خدا شرافتِ عزم و عمل نصیب کرے
کلاہ کج ہو یہ معیارِ کج کلاہ نہیں

تری نگاہ میں ہیں اس کا شکر کر اے دوست
تری نگاہ کی تخلیق مہر و ماہ نہیں

نمودِ حُسن پہ سو بار میں نے دل سے کہا
مقامِ شکر ہے ظالم مقامِ آہ نہیں

گرادیا نہ بلندی نے ان کو یہ کہہ کر
جہاں پناہ ہیں انسانیت پناہ نہیں

زبان شاعر کامل پہ ہو اگر اے تجمؔ
مری نظر میں تعلّی کوئی گناہ نہیں

32

سوچتا ہوں مصرفِ حق سعی باطل میں نہو
کوئی جذبہ میرے دل کا آپ کے دل میں نہو

اے مسافر اس طرح گم عیشِ حاصل میں نہو
تیری منزل دور ہے تو خوابِ منزل میں نہو

شورِ طوفاں سر پہ ہے اور آنکھ کھلتی ہی نہیں
یوں کوئی سویا ہوا آغوشِ ساحل میں نہو

ڈھونڈتا پھرتا ہے کیا دیر وحرم میں بے خبر
دیکھ ان کا گھر کسی ٹوٹے ہوئے دل میں نہو

دردوغم کالحن بھی کچھ عیش کے نغموں میں ہے
بیکسوں کا خون شامل رنگِ محفل میں نہو

روئے لیلیٰ دیکھ تو لے تیرا دل محمل سہی
کوئی تیرے وہم کی مخلوق محمل میں نہو

کشمکش ہے مشکلوں کی نازشِ انسانیت
مجرمِ انسانیت ہے وہ جو مشکل میں نہو

جتنی چاہیں لن ترانی وقت کے بندے کریں
جب کوئی اللہ کا بندہ مقابل میں نہو

دیکھئے نیچی نگاہوں نے کیا دل کا سوال
بدنمائی ہے جو غیرت چشمِ سائل میں نہو

سب سے بڑھ کر نقش انساں کی بلندی ہے یہی
جس کا حق مارا گیا وہ فکر باطل میں نہو

کچھ اضافہ کرکے اٹھو تجمؔ بزم شعر میں
وقت کا مصرف کہیں تحصیل حاصل میں نہو

33

بھر تو دے موت ذرا عمر کے پیمانے کو
وقت لکھے گا لہو سے مرے افسانے کو

دشمن جاں ہی سہی رہبرِ منزل نہ سہی
روشنی موت دکھاتی رہی پروانے کو

غم غلط ہوتے تھے میخانے میں کل کی ہے یہ بات
موجِ غم آج بہالے گئی میخانے کو

دستِ ہمت کی ہے توہین دعا کیا کرتا
عار سمجھا کیا تقلید بدلوانے کو

پاؤں سے ان کے نکلتے ہوئے دیکھی ہے زمیں
ہاتھ سے رکھ بھی نہ پائے تھے جو پیمانے کو

راہِ تدبیر میں حائل ہو تو کعبہ ڈھا دیں
آج سینے سے لگائے ہیں جو بُت خانے کو

کوششِ ضبط نے چہرے کی بدل دی رنگت
کس نے روکا تھا ستم کرکے تڑپ جانے کو

اب یہ قسمت کہ رہوں ذوقِ عمل سے محروم
سر پہ آنکھوں پہ رکھا آپ کے فرمانے کو

کچھ جنوں نے بھی تماشائے خبر دیکھ لیا　　کتنے دیوانے بنے دیکھ کے دیوانے کو

34

پھر اِدھر دیکھتے چلے جاؤ　　بے خبر دیکھتے چلے جاؤ
عرش سے اس طرف ملیں گے قدم　　فرش پر دیکھتے چلے جاؤ
تم پہ صدقہ ہزارہا نظریں　　اک نظر دیکھتے چلے جاؤ
تابِ معراج بال و پر میں نہیں　　بال و پر دیکھتے چلے جاؤ
ظلم سہتے ہیں کچھ نہیں کہتے　　دَر گذر دیکھتے چلے جاؤ
تم پہ نظریں ہیں دونوں عالَم کی　　تم اِدھر دیکھتے چلے جاؤ
ہم غریبوں کا پوچھنا کیسا　　خوش ہیں گر دیکھتے چلے جاؤ
دل ملے ہیں پڑے ہوئے بھی کہیں　　رہ گذر دیکھتے چلے جاؤ
دَر بدر کرکے ڈھونڈتے ہو مجھے　　دَر بدر دیکھتے چلے جاؤ
واقعاتِ حیات بس کے نہیں　　عمر بھر دیکھتے چلے جاؤ

35

میرے دل میں جو دل تمہارا ہو　　دل سے دل کو بڑا سہارا ہو
بات ہی اور ہے اشارے کی　　بات کیوں ہو کوئی اشارا ہو
اس نے اُلٹی ہیں محفلیں اکثر　　جس کو بیگانگی نے مارا ہو
دل ہے دل کا جہاں سوال آئے　　وہ ہمارا ہو یا تمہارا ہو
ہم ہیں اس بے گناہ کے قاتل　　جو گنہ گار کا سہارا ہو
اُس کا عہدِ حیات کیا جس نے　　وقت کٹنے کو دن گزارا ہو
میرے دَر پر ذرا اُتر آئے　　میری قسمت کا جو ستارا ہو
آج میری طرف ہے روئے سخن　　اب کسے بے رُخی گوارا ہو
حجم اُس کے خلاف جانا ہے　　جس طرف زندگی کا دھارا ہو

36

سُنو گے مجھ سے میری ڈوبتی کشتی کا افسانہ
گنا ہوں کے تلاطم میں بھی تیور تھے ملوکانہ

رہے گا حشر تک رندوں میں اک ذوقِ حریفانہ
اٹھا کر اپنے سر پر کون لے جاتا ہے میخانہ

کسی میکش سے کیا الجھوں نہیں یہ شانِ رندانہ
نظر ساقی پہ رکھتا ہوں باندازِ حریفانہ

خبر کیا تھی کہ یہ تمہید ہوگی گھُپ اندھیرے کی
بظاہر شمع روشن دیکھ کر آیا تھا پروانہ

خدا محفوظ رکھے خود پرستی خود نمائی سے
ان آئینوں میں جو منہ دیکھ لے ہوجائے دیوانہ

سنائی میں نے جس جس کو کہانی اپنے عصیاں کی
نگاہیں اس کی کہتی تھیں یہی ہے میرا افسانہ

اب اس سے بڑھ کے ہوگی کیا قیامت ان کے جلوے کی
نظر بازوں میں پیدا ہوگئے انداز جانانہ

جو سر لے کر حکومت تھی تو سر دیکر فراغت تھی
کہاں وہ نزدِ میداں اب کہاں وہ کھیل مردانہ

بڑے ہمدرد ہیں احباب تدبیریں بتاتے ہیں
محبت میں کہیں چلتے ہیں آئینِ حکیمانہ

بھیانک ہے بہر پہلو اگر ملتی نہیں دنیا
جو مل جائے تو ہوجاتی ہے ہر کروٹ عروسانہ

مری نظروں نے تولے ہیں بہت شہکار فطرت کے
ترے حسنِ مکمل کا مری آنکھیں ہیں پیمانہ

37

نگاہِ دوست کی بے التفاتی رائیگاں کیوں ہو
خدا وہ دن نہ لائے مجھ پہ دشمن مہرباں کیوں ہو

نہا کر خوں میں بھی ٹھنڈا کوئی آتش بجاں کیوں ہو
سلامت شانِ خود داری زباں پر الاماں کیوں ہو

ستم مجھ پر کئے جاؤ ستم میرے سر آنکھوں پر
مگر دادِ ستم دینے کو میری ہی زباں کیوں ہو

زمیں جب پاؤں سے نکلی تو ہم باز آگئے سر سے
کہ ایسے وقتِ بد میں دوش پر بارِ گراں کیوں ہو

غرورِ حسن ہوتا ہے مگر ایسا نہیں ہوتا
بلندی آسماں تک ہو بلندی آسماں کیوں ہو

بڑا دھوکہ ہے فطرت کے نظامِ حسن میں ورنہ
تم ایسے خوش جمالوں پر محبت کا گماں کیوں ہو

کہاں جاتے ہو منہ پھیرے مری آنکھوں کو تڑپا کر
تماشا بن کے کیوں جاؤں اشارا رائیگاں کیوں ہو

طلب کرتا ہے سجدہ ان کا آئینِ خودی مجھ سے
میں کہتا ہوں کہ سجدہ میرے ان کے درمیاں کیوں ہو

براہ راست دل لے لو براہِ راست جاں لے لو
محبت کوئی میرے یا تمہارے درمیاں کیوں ہو

تمہیں کو ہو مبارک یہ خدائی یہ خدا بینی
گِلوں شکووں کے نرغہ میں کسی کا امتحاں کیوں ہو

ہنسی آنے لگی رونے کے بدلے اپنی حالت پر
یہ خمیازہ محبت کا نصیب دُشمناں کیوں ہو

یہ صورت ہے کہ برگ وبار پہچانے نہیں جاتے
چمن ہی وہ نہیں پر آستاں ہی آستاں کیوں ہو

شکستہ پا ہو جب اے تجمّل یہ ذوقِ سفر کیسا
دلیلِ کارواں ہونا تھا گردِ کارواں کیوں ہو

38

مسلسل قہقہوں سے ہے تلافی شدتِ غم کی
دماغوں کی فضا بدلی ہوا لگتے ہی پرچم کی

مری نظروں میں اب کیا قدر ہو عیشِ دو عالم کی
شہیدانِ وفا کے غم سے قیمت بڑھ گئی غم کی

وہ کیا جانیں حقیقت اپنے سرکش عہدِ محکم کی
بلا دیتی ہے دل انسان کا نبضوں کی ادھم کی

بہت ممنون ہوں احباب کی چشمِ عنایت کا
مری کمزوریاں دیکھیں نظر اپنی طرف کم کی

خدائی کر گئے کچھ اہلِ دل انساں کے پیکر میں
بدل دی عشق کے بندوں نے صورت نظمِ عالم کی

مٹا سکتے نہیں وہ دشمنی سے میرا یہ جذبہ
خدا رکھے محبت ہے شرافت نسلِ آدم کی

لہو کے گھونٹ پی کر بھی کہیں سیری نہیں ہوتی
بجھاتی ہے کسی کی تشنگی اک بوند شبنم کی

اُٹھا کر دہر سے رسمِ محبت اہلِ دنیا نے
اضافہ علم و حکمت میں کیا انسانیت کم کی

شعورِ عشق کا اک ناز ہے یہ ناسیہ سائی
وہ سجدہ کیا غلاموں کی طرح گردن اگر خم کی

نگاہیں میری کہلاتی ہیں نظارے تو ان کے ہیں
اب ان سے کیا کہوں کیوں روشنی آنکھوں کی مدھم کی

تنک ظرفوں پہ کچھ بجتی نہیں فطرت کی فیاضی
نہ آیا نور پیشانی پہ قسمت بھی اگر چمکی

جو زندہ دل تھے ہنستے کھیلتے جن کی گزرتی تھی
انہیں بھی ہم نے دیکھا آخری اک سانس لی غم کی

عجب کیا شرک کا الزام آئے میرے سجدے پر
محبت دل میں ہے اے تجمّل اک انسانِ اعظم کی

39

کس کرب سے وہ رات قفس میں بسر ہوئی
جس کی سحر بہار کی پہلی سحر ہوئی

دنیا کو دیکھتا ہوں کدھر سے کدھر ہوئی
کیا وقت آگیا کہ وفا دردِ سر ہوئی

نغمہ کی صبح و شامِ غزل کس کے دم سے تھی
ہم قید ہوگئے تو چمن کی خبر ہوئی

فطرت کا جبر تھا مرا اظہارِ دردِ دل
ہوتی نہ تھی یہ غم کی اہانت مگر ہوئی

دنیا کے ہیر پھیر سے بچنا محال تھا
میں دور ہٹ گیا تو وہ نزدیک تر ہوئی

دیکھا چمن کا رنگ بھی سیرِ چمن بھی کی
اب کس امید پر ہوسِ بال و پر ہوئی

انسانیت پر رحم نہ کھاؤں تو کیا کروں
کیسی اسیر مسئلۂ خیر و شر ہوئی

نادیدنی تھے کتنے مناظر نہ پوچھیے
اچھی گناہگارِ تماشہ نظر ہوئی

دادِ ستم بھی دی ہے ستم بھی اٹھائے ہیں
کب تک بڑھے گی بات بہت درگزر ہوئی

کیا مطمئن تھے ذکرِ عذاب و ثواب سے
جتنی بھی دیر یادِ خدا میں بسر ہوئی

غالبؔ کی طرح معترفِ میرؔ ہوں میں نجمؔ
فیضِ سخن سے جس کے غزل معتبر ہوئی

40

جب میں چاہوں گا شبِ غم مختصر ہو جائے گی
جب اٹھے گی چشمِ بے پروا سحر ہو جائے گی

چیخ اٹھا جس دن دعا جان اثر ہو جائے گی
جب سنیں گے تب زمانے کو خبر ہو جائے گی

ہم پہ وقت آیا مگر دنیا نے کروٹ بھی نہ لی
ہم اسی دھوکے میں تھے زیر و زبر ہو جائے گی

موجِ بیدردی پہ تکیہ ہو کہ موجِ درد پر
ظالم و مظلوم دونوں کی بسر ہو جائے گی

آج کی دنیا کو میں اپنا بنا کر کیا کروں
کل یہی دنیا بعنوانِ دگر ہو جائے گی

حُسن کے تیور پہ اک بل ڈال دے گا عشق اگر
روحِ بحر و بر خلافِ بحر و بر ہو جائے گی

زندگی مشکل تو ہے ان کے مریضِ عشق کی
جاودانی زندگی ہوگی اگر ہو جائے گی

ہم دکھا دیں گے نشیمن ہم سے کتنی دور ہے
حسرتِ پرواز جس دن بال و پر ہو جائے گی

آشریکِ درد ہو جا ورنہ اے ناز آفریں
دردِ دل کی چارہ سازی دردِ سر ہو جائے گی

فردِ قسمت اس طرف ہوگی اُدھر فردِ عمل
نجمؔ ظاہر قدرتِ عیب و ہنر ہو جائے گی

41

محبت کم نگاہوں کو نظر میں لا نہیں سکتی
یہ بجلی ہر خس و خاشاک سے ٹکرا نہیں سکتی

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی
کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

گرا کر عرش سے بھی حسن بے پروا نے دیکھا ہے
کوئی عالم ہو میری آدمیت جا نہیں سکتی

متانت آچکی ہے ان کے لہجہ ان کی باتوں میں
وہ چاہیں لاکھ چہرے پر متانت آ نہیں سکتی

نہ سمجھو دوست کی حد تک کمال اپنی محبت کا
ابھی ناقص ہے دشمن کو اگر تڑپا نہیں سکتی

گراہوں رُوبقبلہ جب بھی ٹھوکر میں نے کھائی ہے
مری خود داری ایسی ویسی ٹھوکر کھا نہیں سکتی

کبھی تیرِ نگاہِ ناز خالی جا نہیں سکتا
کوئی نیکی بھی ایسے وقت آڑے آ نہیں سکتی

نشیمن میرا رہنے دو چمن پر آنچ گر آئی
نشیمن ہی پہ آئے گی چمن پر آ نہیں سکتی

حقائق ہی رہیں گے نجم میری فکر کا حاصل
خیال و خواب میں فکرِ سخن الجھا نہیں سکتی

42

بیکسوں کی صفِ ماتم پہ ہے رقصاں کوئی
انقلاب آئے گا پھر گردشِ دوراں کوئی

کیا ڈرائے گا مجھے موت کا عنواں کوئی
میرا دشمن نہیں نزدیک رگِ جاں کوئی

چشمِ عبرت ہے نہ ہے دیدۂ گریاں کوئی
یوں لُٹا ہوگا نہ آباد گلستاں کوئی

چل پڑی موجِ ہوا زلزلہ ساماں کوئی
آندھیاں تیز ہیں ٹھہرے گا نہ ایواں کوئی

اس تلاطم پہ ہے دنیا کا توازن قائم
چشمِ ظاہر سے نہاں ہے کہیں انساں کوئی

کل نہ سمجھا کہ ہے خطرے میں وطن کی عزت
آج میّت پہ ہے انگشت بدنداں کوئی

حشر ہے کاتبِ تقدیرِ بشر کیا ہوگا
ہوگیا بڑھ کے اگر دست و گریباں کوئی

ہنس چکے تو سنی ہے یہی تاریخ اُمم
زینتِ قصر کوئی رونقِ زنداں کوئی

دیکھئے کس کو حقیقت کی حدیں ملتی ہیں
دَرپئے دل ہے کوئی درپئے جاناں کوئی

شکر لازم ہے جو دو چار گھڑی بھی رہ جائے
اپنے حالات و خیالات کا مہماں کوئی

صورتیں جبر و تشدد کی اُتر جائیں گی
پردۂ غیب سے ہوگا جو نمایاں کوئی

غم سے بھی لطف اٹھاتا ہوں مسرت کی طرح
میری ہمت پہ ہے کیوں چاک گریباں کوئی

لُوٹ کر مجھ کو قناعت سروساماں پہ نہ کی
لے گیا ساتھ غرورِ سروساماں کوئی

لے گئی ایک نظر حال بھی مستقبل بھی
یوں نہ ہوجائے بُرے وقت میں ارزاں کوئی

پاؤں پھیلے ہوئے ہیں وسعتِ آزادی میں
مسندِ عیش پہ ہے طفلِ دبستاں کوئی

جان کا روگ ہے یہ خلوتِ ہستی کیا ہے
سر کہیں پھوڑ نہ لے بندۂ احساں کوئی

کتنے شکوے مجھے کرنے ہیں مزے لے لیکر
دو ہی باتوں میں نہ ہوجائے پشیماں کوئی

نیند آنے کی ہے امید نہ موت آنے کی
روک لے کیسے خیالات کا طوفاں کوئی

وہ نہ چاہیں گے تو کیا حال نہ بدلے گا کبھی
ان کے بس کا ہے مرا خوابِ پریشاں کوئی

داغ روشن ہیں غریبوں کا لہو جلتا ہے
نہ چراغاں ہے کہیں اور نہ شبستاں کوئی

عجم فطرت سے مری ولولۂ شعر و ادب
میرے ایک ایک نفس میں ہے غزل خواں کوئی

43

عجب کیا عیش کی غفلت میں سارا دن گزر جائے
کہ ہوش اس دور میں اکثر قریبِ شام آتا ہے

کسی نے بے تکلف بڑھ کے قبضہ کرلیا اپنا
کوئی کہتا رہا یہ تیری خاطر جام آتا ہے

مصیبت پر مری خوش ہونے والے بھی ہیں دنیا میں
بُرا کیا ہے مرا غم دشمنوں کے کام آتا ہے

شعورِ دردِ دل رکھتے ہیں یہ خاصانِ دولت بھی
تڑپ جاتے ہیں جب ذکرِ صلائے عام آتا ہے

بدل دیتی ہے دنیا مختلف مفہوم و معنی میں
جب آتا ہے اُدھر سے ایک ہی پیغام آتا ہے

ابھی اک زلزلہ ہوگا شریکِ رقصِ مے خانہ
ابھی تو جام بے اندیشۂ انجام آتا ہے

گزر جاتی ہے اک تازہ قیامت عجم کے دل پر
کسی کے لب پر ارضِ تاج کا جب نام آتا ہے

44

کیوں اس کو چھیڑتے ہو شبِ غم کے نام سے
وہ بدنصیب دل جو دھڑکتا ہے شام سے

تقدیم انقلاب کی خاطر بڑے بڑے
گھبرا کے اُٹھ کھڑے ہوئے اپنے مقام سے

اے دوست یہ شریعتِ انساں میں کفر ہے
دھوکہ نہ دے کسی کو محبت کے نام سے

میں نظم و ضبطِ زیست کا قائل نہیں مگر
مرنا بھی چاہتا ہوں بڑے اہتمام سے

گیتی کو زلزلہ ہے لرزتی ہے کائنات
سرکے ہیں کس کے پاؤں وفا کے مقام سے

غمخوار بن کے آئے تھے اللہ رے سلوک
بات اور بڑھ گئی سخنِ نا تمام سے

دیکھے تو کوئی شکل مرے ہم صفیر کی
چہرہ اُتر گیا ہے محبت کے نام سے

سجدے میں اک تصور بے جا سہی مگر
آگے میں بڑھ گیا ہوں بہت پیش امام سے

میں فکرِ خیر میں ہوں وہ شر کر چکا بہت
دشمن بچے گا اب نہ مرے انتقام سے

میرے حدودِ ذکر میں اے طائرِ ہوس
پَر جل اٹھیں گے گرمیِ زورِ کلام سے

تنہا تھا میں گناہ کے اقسام سیکڑوں
کوشش تو کی نکل نہ سکا اژدہام سے

بس حاصلِ کلام رہے مدعائے دل
اتنا ہی واسطہ ہے خدا کے کلام سے
ایسے قلم اٹھانے کی نوبت نہ آئے تجمّ
جس طرح کھینچ لے کوئی تلوار نیام سے

45

زندگی غم میں گزرتی ہے رواداری سے
مسلکِ عشق بچاتا ہے دلآزاری سے
نیند کلیوں کی اُڑی آنکھ کھلی سبزے کی
جاگ اٹھا سارا چمن میری گرفتاری سے
جن کی ہشیاری کے دنیا میں نشانے تھے بہت
وہ بھی مارے گئے خود اپنی ہی ہشیاری سے
بزمِ انساں میں کہاں سادگیِ قول و عمل
ایک ذرّہ نہیں محفوظ اداکاری سے
سوچ لو یہ بھی ذرا بات بگڑ جاتی ہے
کام دیکھے تو ہیں بنتے ہوئے غداری سے
آپ اظہارِ عداوت میں تکلف نہ کریں
دل لرزتا ہے محبت کی ریاکاری سے
عہدِ غفلت میں دلوں کی یہ کشاکش تھی کہاں
کس قدر فتنے جگائے گئے بیداری سے
حالِ دل حضرتِ واعظ کا تو معلوم نہیں
ہم کو تسکین ہے احساسِ گنہگاری سے
مجھ کو فرصت ہے کہاں اے خلشِ صوم وصلوٰۃ
جذبۂ دردِ محبت کی پرستاری سے
صفتیں دوزخ و جنت کی خدا ساز سہی
سابقہ ہے ابھی انسان کی فنکاری سے
کس مصیبت میں لطافت مری تخیل کی ہے
تجمّ بے چین ہوں لفظوں کی گرانباری سے

46

انساں سے لاکھ دور ہوں انساں سے کام ہے
اک دن اسے بھی قربِ رگِ جاں سے کام ہے
دل کو لگے گی ان کے تو سمجھیں گے سوزِ غم
فی الحال سوزِ شمعِ فروزاں سے کام ہے
کیوں کیجئے تصور نا ممکن و محال
جب تک فضائے عالمِ امکاں سے کام ہے
ممکن ہے کام گردشِ دوراں کو مجھ سے ہو
میری بلا کو گردشِ دوراں سے کام ہے
وہ منزلِ حیات میں ہے ننگِ اہلِ دل
جس دل کو اپنے درد کے درماں سے کام ہے
غنچوں کو اک تبسمِ موہوم کے لیے
کتنا عظیم صبحِ درخشاں سے کام ہے
دستِ عدو بڑھا بھی تو رسوا کرے گا کیا
پہلے مجھے خود اپنے گریباں سے کام ہے
میرا ہے تجربہ کہ ٹھہرتی ہے کم بہار
کب تک تمہیں بہارِ گلستاں سے کام ہے

تابوت و شامیانہ و قبر و چراغ و گل
اللہ آج بھی سروساماں سے کام ہے
حق نا شناس میرے مخاطب نہیں ہیں نجم
خود داریِ سخن کو سخنداں سے کام ہے

47

شب ہے تمام صبح کا تارا نظر میں ہے
اک سانس مجھ میں ایک چراغ سحر میں ہے
محدود جستجو تری برق و شرر میں ہے
وہ آگ اور ہے جو غمِ معتبر میں ہے
ہمت نہیں تو بیٹھ رہو پاؤں توڑ کے
اک عمر ہوگئی کہ ارادہ سفر میں ہے
یہ میرا صبر و ضبط یہ ماحولِ عیش و غم
تنہا ہوں اور ساری خدائی نظر میں ہے
دل مرکزِ حیات ہے ہر اعتبار سے
دل بجھ گیا تو خیر میں لذّت نہ شر میں ہے
یہ دیس گھر بنا کے بھی پردیس ہی رہا
کیسی انوکھی ریت تمہارے نگر میں ہے
یہ اور بات ہے کہ ہو ماحول ہی غلط
حق کا شعور ورنہ مزاجِ بشر میں ہے
بے ساختہ زباں پر درود آرہا ہے نجم
اک روشنی سی منزلِ فکرو نظر میں ہے

48

مرتے مرتے اہلِ دل کیا سختیاں دیکھا کیے
چارہ گر نبضیں نگاہیں رازداں دیکھا کیے
لڑگئیں نظروں سے نظریں دل سے دل ٹکرا گیا
ہل گئے طبقے زمیں کے آسماں دیکھا کیے
پست ہمت زندگی بھر زندگی کی دوڑ میں
کاروانِ گرد و گردِ کارواں دیکھا کیے
باغباں بھی فکر میں تھا گھات میں صیاد بھی
دو نگہباں تھے کہ میرا آشیاں دیکھا کیے
پھر نہو گمراہ کوئی راہ رَو اس فکر میں
دیر تک ہم اپنے قدموں کے نشاں دیکھا کیے
چار دن گلشن میں پروازِ بہاراں دیکھ کر
دیکھنی تھی سست رفتار خزاں دیکھا کیے
دل مٹے نظریں ہوئیں رخصت زبانیں کٹ گئیں
اہلِ دل اہلِ نظر اہلِ زباں دیکھا کیے
حق پرستوں کو کچلتے ہی رہے قابو پرست
ناتواں یہ مصرفِ تاب وتواں دیکھا کیے
دیکھتیں آنکھیں ذرا فرقِ من و تو رہ گیا
دو قدم پر تھا متاعِ دو جہاں دیکھا کیے
ان پہ رحمت جو چمن میں شاخِ گل کی آڑ سے
ایک بجلی آشیاں در آشیاں دیکھا کیے
پست ہمت کیا پہنچتے منزلِ مقصود تک
راہ ومنزل کو جو طوفاں درمیاں دیکھا کیے

یہ وہی بجلی گری ہے آشیاں پر ہم جسے
رقص میں اکثر قریب آشیاں دیکھا کیے

ہم پہ وقت آیا تو خود داری شریک حال تھی
حجم اربابِ غرض دامن کشاں دیکھا کیے

49

اے تنگ نظر عشق کے جذبوں کو جگا لے
سوتے ہیں ترے دل کے اندھیرے میں اُجالے

کافر تری آنکھیں ہیں مئے حسن سے مخمور
تھوڑی سی محبت کی شراب اور ملا لے

دنیا سے اٹھے جاتے ہیں اربابِ محبت
فطرت کہیں توفیقِ محبت نہ اٹھالے

ممنون ہوں کس کس کا میں اک زیست کی خاطر
ہر ذرّہ کو موقع ہے کہ احسان جتا لے

گرتے مجھے دیکھا کیے اللہ کے بندے
میں رہ گیا کہتا ہوا اللہ بچالے

دنیا کے تلاطم سے مجھے ربط ہے اتنا
بیٹھا ہوں روایاتِ محبت کو سنبھالے

واعظ کو مبارک درِ توبہ کا سہارا
یارب مجھے دنیا سے گنہگار اٹھالے

ہر بندۂ اللہ کو اپنا سا نہ سمجھو
ایسے بھی ہیں بیٹھے ہیں جو کونین سنبھالے

اللہ رے محبت کو محبت کی فضا میں
حجم اس نے کیا ہے مجھے خود میرے حوالے

O

غیر مطبوعہ غزلیات

50

رہتے ہیں دُور مرحلۂ غم سے آدمی
آگے کہاں ملیں گے تمہیں ہم سے آدمی

معدوم سی ہے قیس کی فرہاد کی مثال
گزرے بہت زمانہ میں رُستم سے آدمی

یہ سن کے راستے کے اُٹھائے ہیں سنگ و خشت
اس شہر میں ہیں شعلہ و شبنم سے آدمی

کیوں آتشِ حسد کی فضا میں ہیں جاں بلب
کیا ربط چاہتے ہیں جہنّم سے آدمی

واعظ کسی شہیدِ محبت کا فیض ہے
مانوس ہوگیا جو غم و ہم سے آدمی

کیا کیا فریب دے کے پچھاڑا غرور نے
کن کن بلندیوں سے گرے دھم سے آدمی

باطن میں پست اور ہیں ظاہر میں سر بلند
یہ چشم اعتبار میں مدھم سے آدمی

بھیجا گیا حرم کدۂ زشت و خوب میں
گھبرا گیا تھا ایک ہی عالم سے آدمی

کیا پوچھتے ہو دیدۂ پُرنم کی منزلت
بنتے ہیں حجم دیدہ پُر نم سے آدمی

51

دل ہم سے نہ سنبھلا دل ہی تو ہے
آساں نہ ہوئی مشکل ہی تو ہے

منزل کوئی ان کی اور نہیں
منزل کی طلب منزل ہی تو ہے

سو ہم نے وفا کے وار کئے
بسمل نہ ہوا قاتل ہی تو ہے

دنیا سے لگا تھا دل تو بہت
اُٹھنا ہی پڑا محفل ہی تو ہے

طوفاں کو ہٹا کر پار اُتر
دو ہاتھ پہ وہ ساحل ہی تو ہے

کیا حجم فریبِ دل سے بچیں
دنیا میں فریب دل ہی تو ہے

52

یہ خودداری ہے یا بیگانگی ہے رنگِ محفل سے
نظر کس کس سے مل جاتی ہے دل ملتا نہیں دل سے

اجل اپنی سی کر کے ہٹ گئی آخر مقابل سے
جو زندہ دل تھے زندہ ہی اٹھے دنیا کی محفل سے

کسی صورت انھیں اپنے ستم کی داد لینی ہے
تڑپ لوں گا بآسانی ہنسی آئے گی مشکل سے

سرِ منزل پہنچ کر ان کو دم لینا مبارک ہو
مسافر اُلٹے قدموں بھی پلٹ آتے ہیں منزل سے

وطن میں دوستِ کیسے کوئی دشمن بھی نہیں شاید
مجھے کس کی نگاہیں ڈھونڈھتی آئیں گی ساحل سے

کہیں احساسِ حق گوئی پہ بھی پانی نہ پھر جائے
زباں کھلتی نہیں اندیشۂ اقدارِ باطل سے

نظارہ اس کی قسمت میں ہے لیلائے حقیقت کا
وہ دیوانہ جو چونک اٹھے خیال و خوابِ محمل سے

تعین کی حدیں توڑیں ہیں اکثر دستِ ہمت نے
خدا چاہے تو آگے بڑھ چلوں گا دل کی منزل سے

کہیں آساں تھا اس ہنگامۂ ہستی میں نیند آنا
بڑی مشکل تھی جو حل ہو گئی تدبیرِ قاتل سے

کسے اس کی خبر تھی ان کو آزادی میں ترسیں گے
اسیری میں جو نغمے کر لیے پیدا سلاسل سے

انھیں بھی تجمّل دیکھا ناصیہ سا میرؔ کے در پر
جو اپنے زعم میں آگے ہیں کچھ غالبؔ کی منزل سے

53

صلوٰۃ و صوم سے آئین سرکشی نہ بنا
خدا کے نام کو سرمایۂ خودی نہ بنا

تجھے مکارمِ اخلاقِ آدمی کی قسم
کسی حقیر تمنا کو زندگی نہ بنا

میں اپنے زعمِ بلندی میں مٹ گیا لیکن
کبھی نشانہ احساسِ کمتری نہ بنا

عمل سے پہلے عطا کر خیال کی قوت
خیال ہی میں جو بگڑا وہ پھر کبھی نہ بنا

بڑی نوازشِ فطرت ہے روحِ زندہ دلی
اسے تمسخرِ دربارِ خسروی نہ بنا

دکھائے کون خدا کو یہ عہد خونخواری
کسی نے خوب کہا تھا کہ آدمی نہ بنا

ہر ایک در پہ نہ جا تجمّل داد کی خاطر
کمالِ شعر و سخن کو گدا گری نہ بنا

54

ملی ہے موت بھی قسمت سے شاہکار مجھے
کہ تیز کرنی پڑی خود چھری کی دھار مجھے

خبر تو دل سے ملی ہے ہزار بار مجھے
کبھی تو میں بھی سنوں، اس طرح پکار مجھے

مظاہر ے تو ہیں دونوں طرف محبت کے
نہ اعتبار انہیں ہے نہ اعتبار مجھے

کمالِ فن مرے دستِ طلب سے دور نہ تھا
مگر قبول نہ تھی شرطِ انکسار مجھے

خدا کا شکر ہے دشمن سے خود عوض نہ لیا
ملی تھی خیر سے توفیقِ انتظار مجھے

وہ اپنا روپ ہی جی بھر کے دیکھ لیں کچھ دن
دکھا رہے ہیں جو آئینہ بہار مجھے

یہ کائنات بجز انتظار کچھ بھی نہیں
قدم قدم پہ ہے تکلیفِ انتظار مجھے

مزاجِ دوست نے مرضی پہ اپنی ڈھال لیا
سپرد کرکے دو عالم کا اختیار مجھے

یہ اور کیا ہے جو فطرت کا احتجاج نہیں
جب اپنا عزم و عمل خود ہو نا گوار مجھے

مرے بدن پہ ٹھہرتا نہیں لباس ریا
نظر نظر میں بنا دو گناہ گار مجھے

بدل نہ جائے گا میرے لیے نظامِ چمن
نہ ہو پسند جو نشو و نمائے خار مجھے

ہوا شعورِ محبت کا انتخاب آخر
نہ کرسکا جو کوئی درد بے قرار مجھے

کبھی یہ فیض بھی ہوتا ہے خاکساری کا
سمجھ رہا ہے زمانہ فریب کار مجھے

خدا نہ ہوگا کوئی خاصۂ خدا ہوگا
دکھائی جس نے محبت کی رہگزار مجھے

میں خود ہوں مطمئن اے نجم ادب کی خدمت سے
جگہ نہ دے کہیں تاریخِ روزگار مجھے

55

زیست کی حد ہے جہاں تک ہمت مردانہ ہے
آدمی تاریخ ہے اور آدمی افسانہ ہے

خم کہیں بھرپور ہے خالی کہیں پیمانہ ہے
تو کہاں سوئی ہوئی اے جرأتِ رندانہ ہے

ساری دُنیا اک فریب جلوۂ جانانہ ہے
یہ حرم ہے دور سے نزدیک سے بت خانہ ہے

وقت کا میری طرح اُن کو بھی ہے شکوہ مگر
میرے شکوہ کا ذرا انداز بے باکانہ ہے

یہ کسی نے بھی نہ دیکھا آگ پروانے میں تھی
یہ زمانہ دیکھتا ہے آگ میں پروانہ ہے

کچھ ہوا دیدیں اگر بیرونِ در کی کوششیں
گھر جلانے کے لیے حاضر چراغِ خانہ ہے

تشنگیِ شوق منزل تک سلامت لے کے جا
ہوشیار اے راہ رو ہر موڑ پر میخانہ ہے

پرسشِ احوال پر جُز شکر کچھ کہتے نہیں
بوریے پر بھی مزاجِ اہل دل شاہانہ ہے

56

خاکے جو بنے عزم و عمل سے شہدا کے
فطرت نے مرتب کیے آئین وفا کے

وہ اہل نہ ہوں گے کبھی میدان وغا کے
دل جن کا ہلا دیتے ہیں لفظوں کے دغا کے

اندازۂ محفل تو مجھے دور سے بھی تھا
کچھ اور بھرم کھول دیا پاس بٹھا کے

ہم حق کے طلب گار ہیں سائل تو نہیں ہیں
کیوں لے کوئی دیتے ہو جو تم ہاتھ اٹھا کے

گزری ہے نسیمِ سحری صحنِ چمن سے
غنچوں کو ہنسا کے کبھی شبنم کو رُلا کے

اچھا تو ہے کتنوں کو تباہی سے بچا یا
قسمت نے نمونہ مجھے عبرت کا بنا کے

وہ تُرب ہے مرکز سے یہ مرکز سے ہے دوری
قائل ہیں ہم اس طرح جزا اور سزا کے

باطن میں مرا دوست ہے ظاہر میں ہے دشمن
کہہ دے جو میرے عیب میرے سامنے آ کے

رحمت نے گنہگاروں کو خود حشر میں ڈھونڈا
واعظ نے مجھے مار ہی ڈالا تھا ڈرا کے

نجم اُن کے میری طرح پرستار بہت ہیں
بندوں کی خدائی میں جو بندے تھے خدا کے

57

مجھے بھی دل پہ میرے اختیار ہے کہ نہیں
کوئی خیال کا پروردگار ہے کہ نہیں

بلند ہوں گے کہاں تک لہو کے فوّارے
زمین پہ کوئی سجدہ گزار ہے کہ نہیں

اسی اصول پہ تسکینِ خواہشات کو دے
خزاں کسی کی کسی کی بہار ہے کہ نہیں

میں سوچتا ہوں مقامِ عمل میں نجم ابھی
بہت ہیں عزم کوئی استوار ہے کہ نہیں

58

موت لائے زندگانی لے گئے
پھول کلیوں کی جوانی لے گئے

ہو گیا خاموش جس کے سامنے
حرفِ غم میری کہانی لے گئے

دل ملا تھا ان سے ان کو دے دیا
آج اپنی مہربانی لے گئے

لے گئی اس در پہ دنیا دردِ دل
ہم بھی اپنی بے زبانی لے گئے

غم بھی اک دھوکا تھا راہِ عشق میں
ہم فریبِ شادمانی لے گئے

نجم چپ بیٹھا ہوں ان کی یاد میں
جو مری جادو بیانی لے گئے

59

میرے نفس نفس میں اشارہ سفر کا ہے
دنیا سے کیا کہوں کہ ارادہ کدھر کا ہے

مقصد سرورِ دل کا نہ کیفِ نظر کا ہے
عشق اک اہم سوال وقارِ بشر کا ہے

کتنی دراز میری شبِ غم ہے اے خدا
کس سنگ دل کے ہاتھوں میں دامن سحر کا ہے

اک اک قدم پہ عشق میں سجدہ گزار ہوں
منزل کا اعتبار نہیں رہ گزر کا ہے

کھوئے ہوئے ہیں اپنے ہی پندارِ حسن میں
کیا جانے وہ مقام جو اہلِ نظر کا ہے

سر پھوڑ لوں قفس سے یہ جی چاہتا ہے آج
اہلِ چمن میں ذکر مرے بال و پر کا ہے

حق ناشناس مجھ سے ملاتے نہیں نظر
جس دن سے سامنا مری فکر و نظر کا ہے

چاہے تو حسن میں بھی نکالے ہزار عیب
کیا اعتبار لذتِ نقد و نظر کا ہے

شمع و پتنگ غنچہ و گل نغمۂ نشاط
اے بزمِ عیش کھیل یہ سب رات بھر کا ہے

میرے سوا کسی کو نہیں میری معرفت
چرچا جگہ جگہ مرے عیب و ہنر کا ہے

دنیا کے زشت و خوب ہیں میری نظر میں نجم
کس کس سے واسطہ میرے ذوقِ نظر کا ہے

60

کیا خبر تھی زندگی کا مدعا بدلیں گے ہم
ہر نئی کروٹ پہ قسمت کے خدا بدلیں گے ہم

فرض ہے کیا روندتے جانا گل و گلزار کو
دورِ منزل سلامت راستا بدلیں گے ہم

شورشِ مزدور ہے بے حبِّ سرمایہ غلط
وقت آئے گا کہ وضعِ ماسوا بدلیں گے ہم

نبضِ ہستی پر ہے صدیوں سے ہماری انگلیاں
جب مرض میں ہوگی تبدیلی دوا بدلیں گے ہم

یہ خیال خام ہے کس کم نظر کج فہم کا
مسندِ شاہی سے اپنا بوریا بدلیں گے ہم

پیروی میں ہے سیاست، پر سیاست ہوگی نجم
جب زمانے میں کوئی پہلو نیا بدلیں گے ہم

61

کچھ عقل نے بگاڑا کچھ عشق نے سنوارا
انسانیت نے پائی پھر زندگی دوبارا

توہینِ عشق برحق میں نے نہ کی گوارا
دنیا نے میری خاطر کیا کیا نہ روپ دھارا

طے کتنی منزلیں کیں پر سوچتا ہوں اکثر
شب صبح تک گزاری دن شام تک گزارا

دم بھر سکوں نہ پایا احساسِ زندگی سے
جیتے ابھی بہت دن فکر و نظر نے مارا

اک وہ بھی بے کسی کا عالم تھا زندگی میں
جب نام لے کر اپنا میں نے ہی خود پکارا

یوسف کہا جو تم کو تو چیں بہ جبیں ہوئے کیوں
جائز ہے ہر زباں میں تشبیہ و استعارا

کیا کیا مقابلے تھے فرزانگی سے میری
ہارا تو یہ زمانہ دیوانگی سے ہارا

کیا عشق کی فضا میں زعمِ فرد کی ہستی
ہتھیار رکھ دیئے سب سرکش نے دم نہ مارا

بدلا ہے نجم کیسا معیارِ شعر فہمی
جب سطحِ شاعری سے نغمے نے سر ابھارا

62

نازِ تسبیح و مصلاّ اور ہے
زیرِ خنجر ہو جو سجدا اور ہے

مسخ ہوتے ہیں ارادے بار ہا
کوئی شاید کار فرما اور ہے

کل ہمیں ہم تھے وہ دنیا اور تھی
اب تمہیں تم ہو یہ دنیا اور ہے

دل میں کر حسنِ عمل سے روشنی
اس اندھیرے کا اجالا اور ہے

کج روی تعلیم ہے ماحول کی
ورنہ فطرت کا تقاضا اور ہے

ختم ہے دم بھر میں یہ بازی گری
ایک دو سانسوں کا دھوکا اور ہے

ڈرتے ڈرتے میں خدا کہہ دوں مگر
وہ نہ کہہ دے میرا بندہ اور ہے

نجم کہہ سُن کر بہت کچھ کر لیا
کچھ نہ کہنے کی تمنا اور ہے

63

مرا آغوشِ نظر یاد آیا
جلوۂ دوست کو گھر یاد آیا

آنکھ ہنگامۂ محشر میں کھلی
فتنۂ راہ گزر یاد آیا

غیرتِ عشق بھی ہاتھوں سے گئی
دل اگر بارِ دِگر یاد آیا

اب ملاتے نہیں دنیا سے نظر
کوئی گستاخ نظر یاد آیا

آپ کے در پہ ملا سر اپنا
سجدہ یاد آیا تو سر یاد آیا

ہوش ہستی پہ ہُوا جوشِ کرم
دل اِدھر درد اُدھر یاد آیا

آج بیٹھے ہیں وہ شمشیر بکف
کس گنہگار کا سر یاد آیا

نجم یہ فکر ہے نذرِ غالبؔ غالبؔ خستہ جگر یاد آیا

64

فضائے عشق میں لایا گیا ہوں دو عالم سے نکلوایا گیا ہوں
مری دل بستگی دنیا سے دیکھو کہ جیسے بارہا آیا گیا ہوں
دوا دے کر تھکے جب چارہ فرما دعائیں دے کے بہلایا گیا ہوں
خوشی بھی اک تڑپ تھی درد و غم بھی بہر تقدیر تڑپایا گیا ہوں
نہ سمجھا نجم جب میں رازِ ہستی محبت دے کے سمجھایا گیا ہوں

65

خداوندیاں ہیں ستم رانیاں ہیں یہی بندہ پرور جہاں بانیاں ہیں
میں آسائشِ دل کا پیغامبر تھا نہ ہونے سے میرے تن آسانیاں ہیں
مسرت کی محفل بھی دیکھی ہے ہم نے حکایاتِ غم کی فراوانیاں ہیں
امیدیں تھیں کیا مجھ کو معصومیت کی گناہوں پہ دنیا کو حیرانیاں ہیں
دماغوں کی اے کاش ہوتی رسائی جہاں تک زبانوں کی جولانیاں ہیں
محبت کے ارماں وفا کی امنگیں یہ معصوم بچوں کی نادانیاں ہیں
بہت نجم اہل سخن ہم نے دیکھے خوش الحانیاں ہیں خوش الحانیاں ہیں

66

میں نے دیکھا ہے شباب آتا ہوا کائناتِ حسن ٹھکراتا ہوا
دونوں عالم کی نگاہیں اُٹ گئیں تو کہاں جاتا ہے شرماتا ہوا
آستاں پیدا کروں گا آستاں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا ہوا
شکر ہے آتا ہے اب تیرا خیال کچھ نہ کچھ ارشاد فرماتا ہوا
حادثے کیا کیا مری نظروں میں ہیں دل سے دل دیکھا ہے ٹکراتا ہوا
میں حریمِ ناز میں در آگیا پردۂ کونین سرکاتا ہوا
نجم کیا روکے گی یہ دنیا مجھے میں نکل جاؤں گا ٹھکراتا ہوا

67

بچ کے جو طوفانِ غم سے تر گئے
ناخدا کیسا خدا سے پھر گئے

اپنے کانوں تک دھمک پہنچی نہیں
کیا بلندی ہوگی جس سے گر گئے

جی رہے ہیں کچھ شہیدانِ وفا
بچ گئی انسانیت دل پھر گئے

ذہن مشکل کی طرف جاتا نہیں
کس قدر آسانیوں میں گھر گئے

حجم اب دونوں ہیں آوارہ وطن
دیس سے اردو گئی شاعر گئے

68

دنیا جسے ملتی ہے محبت نہیں ملتی
باطل کے سہارے سے حقیقت نہیں ملتی

کیا کیا نہ ملے قدرت وحکمت کے خزانے
انساں کو مگر بہرِ مشیت نہیں ملتی

ہستی کے گزرگاہ کے بے درد مسافر
رستے میں پڑی درد کی دولت نہیں ملتی

اٹھتی ہی نہیں حسن پہ میری نگہہ شوق
جب تک نگہِ ناز سے دعوت نہیں ملتی

تم خواب میں موجود تصور میں ہو حاضر
احساسِ نظر کو کبھی راحت نہیں ملتی

میں جان وفا اور وہ دشمن ہیں وفا کے
انسان سے انسان کی فطرت نہیں ملتی

کیا دل میں تلاطم ہو تو کیا خون میں گرمی
بازارِ وفا سرد ہے قیمت نہیں ملتی

دنیا کی نظر دیکھ کے روپوش ہیں جلوے
کھوئی ہوئی اللہ کی قدرت نہیں ملتی

69

پھر غم و درد کی دھوپ ڈھلنے لگی
پھر خیالات کی رو بدلنے لگی

عاشقی دور حاضر میں پنپے کی کیا
سن رہے ہیں خرد پاؤں چلنے لگی

تم تو چپ ہوگئے ذکرِ غم چھیڑ کر
بات میں بات آخر نکلنے لگی

رحم کیجئے محبت کے احساس پر
آبروے وفا خوں اگلنے لگی

کچھ کمی شامِ غم کے اثر میں نہیں
چاند کملا گیا رات ڈھلنے لگی

کوئی نیکی ضرور آڑے آئی کلیم
ہوش واپس ہوئے نبض چلنے لگی

میری دیوانگی کی ادا دیکھ کر
ان کی فرزانگی ہاتھ ملنے لگی

سوزِ غم سے مرا دل سلگتا رہا   آگ دکھلاتے ہی شمع جلنے لگی

آج دادِ سخن پر ہیں چیں بر جبیں   نجم اب ان کو ہر بات کھلنے لگی

70

جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر   گھر میں بھر لے ساری دنیا لوٹ کر

اپنے آئینہ پہ نازاں ہے فلک   رہ گیا تھا اک نظر میں ٹوٹ کر

کس قدر ہے سازو سامانِ حیات   جی گئے خوفِ خدا سے چھوٹ کر

چشمِ ظاہر ہی سے دنیا کو نہ دیکھ   رہ نہ جائیں دل کی آنکھیں پھوٹ کر

دانۂ گندم سے ہیں محروم آج   پھانکتے تھے کل جو موتی کوٹ کر

ہم سے پہلے بارہا جو لٹ چکے   آج اکڑتے پھر رہے ہیں لوٹ کر

نجم اب دنیا فضا پر بار ہے   کاش گرجاتا یہ تارا ٹوٹ کر

71

اللہ اللہ اہل دل کی دسترس   ظلم کے طوفاں کی چھاتی پھٹ گئی

حاصل حکمت ہیں اب خونریزیاں   علم جب حد سے بڑھا مت گھٹ گئی

موت کو بھی دو قدم ہٹنا پڑا   زندگی میدان میں جب ڈٹ گئی

لٹ رہا تھا دردِ دل روزِ ازل   تم کہاں تھے جب یہ دولت بٹ گئی

چاند بھی نکلا تو گہنایا ہوا   ہم یہ سمجھے تھے کہ بدلی چھٹ گئی

بڑھتے بڑھتے درد ملت بڑھ گیا   گھٹتے گھٹتے آدمیت گھٹ گئی

میں چراغِ عقل روشن کرچکا   اب نظر میری طرف سے ہٹ گئی

مرحبا اے رشتۂ لطف و کرم   بات جیسے درمیاں سے کٹ گئی

نجم فیضِ ناامیدی دیکھنا   غم گیا کھٹکا گیا آہٹ گئی

72

سنا سب کچھ جو سننا تھا کہا سب کچھ جو کہنا تھا   وہ دنیا سے بگڑتا کیوں جسے دنیا میں رہنا تھا

اسیرِ ظلم نے فطرت بدل دی موم و آہن کی   وہی لوہے کی ہتھکڑیاں وہی پھولوں کا گہنا تھا

یہ بہتر تھا کہ پیدا ہی نہ ہوتا گوشۂ دل میں
ترے غصہ کا جذبہ جس کو آنسو بن کے بہنا تھا

بہت سے کام تھے دنیا میں کرنے کے جو کر جاتے
جفائیں بھی اٹھانی تھی وفا کا غم بھی سہنا تھا

ہوئے احباب رخصت تجمّ اپنا دردِ دل کہہ کر
کسی نے کچھ نہ پوچھا ہم سے کچھ ہم کو بھی کہنا تھا

73

سکونِ دل کی لذت چاہتا ہوں
فقیری میں یہ دولت چاہتا ہوں

حکومت کی محبت دشمنوں کو
محبت کی حکومت چاہتا ہوں

سیاست کا اندھیرا چھا رہا ہے
ذرا نورِ صداقت چاہتا ہوں

انہیں یہ پاؤں پھیلانا مبارک
کہیں میں بھی سکونت چاہتا ہوں

بہت کیا چاہتا ہوں آدمی سے
ذراسی آدمیت چاہتا ہوں

گئے تجمّ اہلِ دل دنیا سے کتنے
بس اب میں بھی اجازت چاہتا ہوں

74

بلا ہے محبت ہماری تمہاری
یہ دوزخ ہے جنت ہماری تمہاری

جفا کا نیا کس نے مسلک نکالا
وفا تھی شریعت ہماری تمہاری

ملے کس طرح بے نگاہیں ملائے
زمانہ کو فرصت ہماری تمہاری

اٹھالو کہ رہنے دو اپنے دو عالم
رہے گی محبت ہماری تمہاری

تمہارے لیے دل بنایا ہے ہم نے
اب آگے ہے قسمت ہماری تمہاری

سنبھل جاؤ تم بھی کہ ہم بک چکے ہیں
محبت ہے قیمت ہماری تمہاری

کہاں تجمّ اب عارفِ حسن کوئی
نظر ہے غنیمت ہماری تمہاری

75

کوئی ڈوبے کوئی اُبھر آئے
وہ دعا دے کے پار اتر آئے

یوں بھی حسنِ عمل چھپاتے ہیں
جیسے کوئی گناہ کر آئے

دل پہ احساں ہے نشترِ غم کا
نقشِ انسانیت اُبھر آئے

خاک و خوں میں نہا کے میداں سے
کتنے جانباز بن سنور آئے

کچھ اصولِ حیات ذہن میں تھے   منبروں پر بیان کر آئے
فکرِ برحق سے جاوداں کردے   جب ترا عہد مختصر آئے
دیکھ لی شان رہنمائی کی   تجم خود ہی نہ راہ پر آئے

76

میرے مزاجِ درد کو رسوا نہ کیجئے   آتا نہیں یقین تو پوچھا نہ کیجئے
للّٰہ یہ نوازشِ بے جا نہ کیجئے   میری نگاہ سے مجھے دیکھا نہ کیجئے
رحمت کا اعتبار بھی جاتا ہے ہاتھ سے   اب کرچکے گناہ تو پروا نہ کیجئے
یہ دردِ دل سے جنگ یہ غم سے مقابلے   فطرت سے بات بات پہ جھگڑا نہ کیجئے
جس نے سمجھ کی بات کہی دل پہ چوٹ لی   آتا ہے دل میں بات کو سمجھا نہ کیجئے
مفہوم زندگی ہے محبت کا ایک دن   دو دن کی زندگی پہ بھروسا نہ کیجئے
کہدو نئے زمانے کی ترچھی نظر سے تجم   ہم آپ جارہے ہیں تقاضا نہ کیجئے

77

کیا اپنا سانس لینا آہیں سی بھر رہے ہیں   دن غم میں کیا گزرتے ہم خود گزر رہے ہیں
قائم رہے الٰہی خود داریٔ محبت   تم یاد آرہے ہو ہم یاد کررہے ہیں
ہستی کسی کے غم میں برباد کر رہا ہوں   مٹی نکھر رہی ہے ذرّے سنور رہے ہیں
فکر و نظر میں کتنا دلچسپ فاصلہ ہے   دیکھا تو جی رہے ہیں سوچا تو مر رہے ہیں
کیا ہم سے پوچھتے ہو اس دل کی سادگی کو   یہ ان کے دل سے پوچھو جو رنگ بھر رہے ہیں
اے تجم گا رہا ہے میری غزل وہ ظالم   نغموں کی بانسری سے نالے گذر رہے ہیں

78

فکر و دانش آزما کر کیا کروں   اک بلا دنیا پہ لاکر کیا کروں
میرا غم بھی میرے قابو کا نہیں   فطرتاً آنسو بہاکر کیا کروں
اپنے دل کو دل بناکر کیا کیا   تیرے دل کو دل بناکر کیا کروں
جس کی ہو بنیاد میری مفلسی   اس درِ دولت پہ جاکر کیا کروں

جاگنے والے ابھی جاگے نہیں　　سونے والوں کو جگا کر کیا کروں
بندگی بے چارگی سی ہوگئی　　بندہ پرور سر جھکا کر کیا کروں
دیکھ اے واعظ مرا عرشِ سخن　　میں ترے منبر پہ جا کر کیا کروں
تجمّل خود ہوں میں بہارِ جاوداں　　پھر گلوں پر خار کھا کر کیا کروں

79

کچھ ایسی وضع کے دل ایسے غم بھی ہوتے ہیں　　ہم اپنے حال پہ بے آنسوؤں کے روتے ہیں
شمار ان کا نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں　　وہ کم نصیب جو پاتے ہیں کچھ نہ کچھ کھوتے ہیں
بنایا جاتا ہے کعبہ کے سامنے کعبہ　　خدا پرست یہ سجدے کہاں ڈبوتے ہیں
ستم کی چھائی ہے بدلی لہو برستا ہے　　زمانہ جاگ اٹھا ہم مزے میں سوتے ہیں
خراب جلوۂ ظاہر تجھے خبر کیا ہے　　گناہگار بہت بے گناہ ہوتے ہیں
انہیں بھی شوق ہے معصومیت کے جامہ کا　　سنا ہے دامنِ فطرت کے عیب دھوتے ہیں
جناب تجمّل یہ شعر آفرینیاں کب تک　　بہت سے آپ کے ساتھی لحد میں سوتے ہیں

80

کیسی خموشی کیسے اشارے　　حق کہہ گئے ہم بانکے
سیکھے نہیں تم احساں کرنا　　مرتے نہیں ہم تلوار مارے
ہارے ہوئے تو ہارے ہوئے تھے　　جیتے ہوئے بھی آخر میں ہارے
اللہ اب تک جینا نہ آیا　　راتیں بھی کاٹیں دن بھی گذارے
منشا کسی کا حکمت کسی کی　　الزام مجھ پر سارے کے سارے
کتنے ہی ڈوبے کتنے ہی اُبھرے　　بیٹھے رہے ہیں دریا کنارے
ہاں ہاں بڑھے جا تنہا مسافر　　اپنے بھروسے اپنے سہارے
اے تجمّل کتنے اہلِ سخن نے　　میرے سخن کے چپّے اُتارے

81

خوش رہے خاک چھاننے والا　　میرا ہر عیب جاننے والا

ہاتھ دھوکر بھی مطمئن نہ ہوا   خونِ ناحق میں سانٹنے والا
چپ ہیں بڑھ بڑھ کے بولنے والے   مرمٹا جی میں ٹھاننے والا
جان پہچان کر بھی ہو انجان   تم سے اچھا نہ جاننے والا
جنبشِ لب کہاں سے لاتا ہے   جیت کر ہار ماننے والا
رو پڑے ایک دن خدا نہ کرے   غم میں ہنسنے کی ٹھاننے والا
جاگتا ہے کہ سورہا ہے نجم   چادرِ ماہ تاننے والا

82

پوچھتے کیا ہو جلالت اُس حریمِ ناز کی   میرے دل کو منزلت حاصل نئے انداز کی
عشق اک منزل ہے معیارِ نیاز و ناز کی   موت یہ سرکش کی ہے اور زندگی سرباز کی
میں شبِ غم کے طلاطم میں اکیلا ہوں مگر   آس ہے اک جانی پہچانی ہوئی آواز کی
آخری سانسیں ہیں لب پرورِدِ دل آتا نہیں   ہے ابھی تک جستجو پیرایۂ آغاز کی
کتنے سودے ہورہے ہیں دردِ دل کے نام پر   کس قدر پچھتارہا ہوں بات کہہ کر راز کی
رکھ دیا ہے زندگی کس نے سکونِ دل کا نام   یہ بھی کوئی زندگی ہے موت کے انداز کی
آج تک ہیں میری فریادیں فضا میں بے اثر   ایسی ناکامی اور اتنی زندگی آواز کی
وقت سے آخر کو دو دو ہاتھ ہوکر ہی رہی   ابتدا میں ہم نے ہر شوخی نظر انداز کی
سب نے اپنے اپنے مقصد کے بنا رکھے ہیں چاند   اپنی اپنی حد میں سب نے چاند تک پرواز کی
یوں سمجھ میں آنہیں سکتا شعورِ زندگی   موت دیکھی ہی نہیں تم نے کسی جاں باز کی
نجم فن شعر پر کیا منحصر ہے انقلاب   اب ہے دنیا میں محبت بھی نئے انداز کی

83

دنیا سے گزرنا ہے گزرنا نہیں آتا   جس کے لیے جیتے ہیں وہ مرنا نہیں آتا
آساں ہی سہی ہم سے خوشامد نہیں ہوتی   دشوار ہے وہ کام جو کرنا نہیں آتا
میداں میں نکھرتی ہے دلیروں کی جوانی   ہر آئینہ خانہ میں سنوارنا نہیں آتا
کیا خاک مذلت سے ابھرتی نہیں قومیں   کیا ڈوب کے نبضوں کو اُبھرنا نہیں آتا

اس وہم میں ہیں طاقت امروز کے مالک
چڑھتے ہوئے دریا کو اترنا نہیں آتا

سنتا ہوں کہ انساں سے بہت ڈرتے ہیں اے نجم
انساں جنہیں اللہ سے ڈرنا نہیں آتا

84

کسے غرض تھی جو ہو کی فضا میں جا ملتا
تلاش کوئی نہ کرتا اگر خدا ملتا

یقین ہے کہ ستارے جگہ سے ہٹ جاتے
قدم جو ہم بھی اٹھاتے تو راستا ملتا

ترے خیال میں ہوتی فدا بھی جان اگر
ترا خیال کبھی تو عمل سے جا ملتا

سکونِ قلب کوئی رہ گزر کی چیز نہیں
اٹھا کے لے ہی نہ آتے اگر پڑا ملتا

حیات وعلم ونشاط و ملال و دانش و مرگ
بشر کو اور لباس بشر میں کیا ملتا

ستم ہی تھا جو کہیں معرفت میں کھو جاتے
جناب نجم کہاں آپ کا پتا ملتا

85

جی رہے ہیں سہل و ممکن کے لیے
زندگی پائی تھی اس دن کے لیے

ایسے ایسے بھی ہیں مردِ اعتبار
کھودیا ظاہر کو باطن کے لیے

اب تو جنت ہم پہ واجب ہوگئی
عمر بھر ترسے ہیں ممکن کے لیے

کیسے کیسے عزمِ محکم دل میں ہیں
جمع کر رکھے ہیں کس دن کے لیے

ہائے وہ طفلی وہ عہدِ بے شعور
موت بھی آساں ہے اس سن کے لیے

نجم دنیا میں بہت سے کام ہیں
آدمی درکار ہے جن کے لیے

86

مجھے بھی دل پہ مرے اختیار ہے کہ نہیں
کوئی خیال کا پروردگار ہے کہ نہیں

چمن کے سینچنے والے ذرا نگاہ تو کر
نمود غنچہ و گل ہو نہار ہے کہ نہیں

بلند ہوں گے کہاں تک لہو کے فوارے
زمین پر کوئی سجدہ گذار ہے کہ نہیں

ہر انتظار ہے کیا زندگی سے وابستہ
کسی کو موت کا بھی انتظار ہے کہ نہیں

یہ عیش پر ہے بھروسہ یہ غم سے بے ربطی
نظر میں گردش لیل و نہار ہے کہ نہیں

اسی اصول پہ تسکین خواہشات کو دے
خزاں کسی کی کسی کی بہار ہے کہ نہیں

میں سوچتا ہوں مقام عمل میں نجم ابھی   بہت ہیں عزم کوئی استوار ہے کہ نہیں

87

تعمیر آدمیت ترکیب رنگِ و بو ہے   تہذیب آدمیت یا آگ یا لہو ہے
جب کھو گیا تو ڈھونڈا جب ہٹ گیا تو پوچھا   اب کچھ مری ضرورت موضوع گفتگو ہے
دنیا بنا رہے ہیں عقبیٰ خراب کر کے   دنیا کی ابتدا سے یہ نظمِ جستجو ہے
اچھے ہوں یا بُرے ہوں دونوں یہیں رہیں گے   میں ہوں تری نظر میں میری نظر میں تو ہے
عمرِ رواں سے آگے پاتا ہوں تیری منزل   ذوقِ گناہ تجھ میں کیا قوت نمو ہے
میں پاک دامنی کے دعویٰ سے ہوں مبرا   وہ اور کچھ ہیں جن پر تکلیف شست وشو ہے
ان پر نظر نہ رکھوں جن کی ضمانتوں میں   ملت کی عافیت ہے مذہب کی آبرو ہے
ہم نے شرف دیا ہے اے نجم اس زباں کو   اردو ہمارے گھر کا اندازِ گفتگو ہے

88

ستم کو مذہب و ملت کا آسرا نہ رہے   جہاں میں اب تو جہاں ہم رہیں خدا نہ رہے
زمانہ آج فراموش و در گذر کردے   ترا گناہ جو تجھ کو پکارتا نہ رہے
بساط عجز سے اٹھ کر ہے عزم مستحکم   یہ دیکھ لے کہیں پہلو کوئی دبا نہ رہے
شکستہ پائی بھی تھی کارواں کی میری بھی   وہ کارواں نہ رہے وہ شکستہ پا نہ رہے
مٹا سکے گا کہاں تک نشانِ گمراہی   کہیں کہیں ترا نقشِ قدم پڑا نہ رہے
میں آپ گھونٹ دوں اپنی سخنوری کا گلا   روش جو فکر کی اے نجم عامیانہ رہے

89

حال پر بارہا زوال آئے   نہ مگر وقتِ عرض حال آئے
تنگ دل منہ پھرا کے میداں سے   کیسی اچھی اجل کو نال آئے
دل کی پاکیزگی ارے توبہ   یادِ دشمن بھی بے ملال آئے
دور تک آدمی نہیں ملتا   آدمیت کا جب سوال آئے
اب وہ اپنا ہو یا مقابل کا   شکر ہے ہم لہو میں لال آئے

مردہ دل دل سنبھالتے ہی رہے
دل جلے حوصلے نکال آئے

ساعتوں میں بھی جو گنے نہ گئے
مدتوں ایسے ماہ و سال آئے

آنکھ میں آنکھ ڈالنا کیسا
دل میں کافر کے دل نہ ڈال آئے

اس کی محفل ہے اس کا میداں ہے
جس کو اپنی سی بول چال آئے

حجم بیٹھے ہیں پاؤں توڑ کے یوں
جیسے دنیا کو دیکھ بھال آئے

90

یہ بھی ہے کوئی زندگی کیا یہی کائنات ہے
تیرا سکون الحذر موت ہے یا حیات ہے

میرے ہی جیسے آدمی سجدہ گزار ہر طرف
میرا ہی جیسا آدمی مالک شش جہات ہے

ہائے وہ شام بے خودی ہائے وہ جام بے خودی
پوچھ رہے ہیں سرنگوں صبح ہوئی کہ رات ہے

جان پہ کھیل جا فقط کھیل ہے ایک سانس کا
زیست سے بھی ہے مخلصی موت سے بھی نجات ہے

ان کی تونگری سے ہے سب کو نیاز کا شرف
میری غریب زندگی مانع التفات ہے

آج بدل گئی جگہ اپنی ہی چال ڈھال سے
اوج فلک پہ ہم ہی تھے حجم یہ کل کی بات ہے

91

اے درپے سیاست آگاہِ راز ہوجا
ہنگامہ سے الگ رہ ہنگامہ ساز ہوجا

کیا میری بندگی اور کیا تیری بے نیازی
پیدا کر اک مقابل اور بے نیاز ہوجا

پستی کے خرمنوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں
اپنی بلندیوں سے تو نے نواز ہوجا

اللہ کا کوئی حق گردن پہ رہ نہ جائے
بندوں سے منہ پھراک کر محوِ نماز ہوجا

وحدت سے تو بھی کرلے اک اور شان پیدا
محفل نئی جما کر محفل طراز ہوجا

محتاج شرح جو ہو وہ حجم شاعری کیا
ہر شعر پر یہ قدغن دنیائے راز ہوجا

92

زندہ دلوں نے بارہا بحر فنا سے دی نجات
یہ نہ سنبھالتے اگر ڈوب گئی تھی کائنات

کہتے ہیں وہ فضول ہیں آپ کے سب توقعات
ان کا خدا بھلا کرے چھین لی میرے منہ کی بات

اس کو خبر نہیں ابھی میری حیاتِ عشق کی
موت سمجھ رہی ہے یہ خاک میں مل گئی حیات

آ گیا دل وجود میں جمع ہوئیں جب ایک جا
حسن کی کچھ تجلیاں عشق کی کچھ خصوصیات

فرشِ زمیں پہ ہم نشیں فرش ہے بوریے کا بھی
اب تو بہت ہی بڑھ چلا حوصلہ تکلفات

حسن ہو یا وہ عشق ہو ہے کوئی واجب الوجود
مجھ کو یقین کیوں نہ ہو خود ہوں شریک ممکنات

دیکھ رہے ہیں یوں مجھے وقت کے اعتبار پر
جیسے انھیں کے ہاتھ ہے آج نظامِ کائنات

کون مجھے یہ لے چلا شوق کی راہ راست پر
کھل گئی غم کی چاندنی ڈھل گئے سب توہمات

زیست حرام ہوگئی دیکھیے اور کیا کریں
عقل کی یہ جسارتیں فکر کے یہ تصرفات

باعثِ زندگی سہی میں وہ قبول کیوں کروں
ساتھ ہے التفات کے ان کا غرور التفات

جس کی عطا تھی زندگی تجمّ اسی کے در پہ تھا
جتنی بڑھیں عنایتیں اور بڑھے مطالبات

93

بادۂ تلخ کام کیا کرتا
نشّہ مے قیام کیا کرتا

دل کی گہرائیوں میں جانا تھا
عالمانہ کلام کیا کرتا

دوریٔ منزل و سفر توبہ
لغزشِ چند گام کیا کرتا

رو دیے بے بسی پہ دشمن کی
جذبۂ انتقام کیا کرتا

یہ مداوائے درد دل تو نہیں
میں دعا اور سلام کیا کرتا

ترکِ صوم و صلوٰۃ کی ٹھہری
اور میں بے امام کیا کرتا

بیش و کم ہے نظامِ فطرت تجمّ
آدمی انتظام کیا کرتا

94

جلوے ترے نظر میں سموئے ہوئے سے ہیں
مجھ کو جو پا گئے ہیں تو کھوئے ہوئے سے ہیں

کیا پوچھتے ہو عشق کی ناکامیوں کا درد
روئے اگر نہیں ہیں تو روئے ہوئے سے ہیں

ہنگامۂ مجاز و حقیقت ہے ہر طرف
اک ہم ہی درد عشق میں سوئے ہوئے سے ہیں

آنکھوں کا اتہام ہے آنکھیں کہاں ہیں اب
دھبّے گناہِ دید کے دھوئے ہوئے سے ہیں

تم خود ہی دیکھ لوگے غمِ زندگی میں ہم
ڈوبے ہوئے سے ہیں کہ ڈبوئے ہوئے سے ہیں

اوراقِ گل سے کس نے یہ کی دعوتِ نظر
شبنم کے آنسوؤں میں بھگوئے ہوئے سے ہیں

کیا ڈھونڈتی ہے نجم نگاہِ سخن شناس — ہم اپنے کیف شعر میں کھوئے ہوئے سے ہیں

95

حقیقتوں کی کسی وقت بھی کمی نہ رہی — قصورِ فکر و نظر ہے جو تشنگی نہ رہی
ہوئی تھی خاک سے پاک اور خاک بھی نہ رہی — وہ مشتِ خاک جو مفہومِ آدمی نہ رہی
پڑا رہا ہے عداوت پہ عمر بھر پردہ — مگر نگاہ محبت کبھی چھپی نہ رہی
کہاں وہ عہد گذشتہ کی دوستی اے دوست — وہ دشمنی کی شرافت وہ دشمنی نہ رہی
کچھ ان کا رحم و کرم بھی ہے ذمہ دار اس کا — نگاہ میں کوئی ہستی گناہ کی نہ رہی
ہمیشہ موت کے بعد اہلِ دل کو پہچانا — وہ کون تھا جسے دنیا پکارتی نہ رہی
چھپا رکھے ہیں زمانے سے کتنے عیب اپنے — خدا کی شان حقیقت بھی گفتنی نہ رہی
زمانہ ہوتا موافق تو کیا نہ کچھ کرتے — دلِ غریب میں جذبات کی کمی نہ رہی
مری جگہ ہے یہ دنیا کا آئینہ خانہ — جو دیدنی تھی وہ صورت بھی دیدنی نہ رہی
پڑا جو وقت تو مرحوم کہہ دیا دل کو — یہ کس زبان سے کہہ دیں کہ زندگی نہ رہی
ہنسی خوشی کا یہ کیسا گناہِ بے لذت — خوشی خوشی نہ رہی جب ہنسی ہنسی نہ رہی
ہر اک کی لغزشیں دیکھیں ہر اک کو ٹوک دیا — مری نگاہ تھی اور مجھ کو دیکھتی نہ رہی
صلہ کچھ اس کے سوا نجم کو نہیں منظور — اگر ذریعہ عزت یہ شاعری نہ رہی

96

قفس میں جو ہمیں توہینِ غم نظر آئی — وہ درد اٹھا ہے کہ پھر دل کی چوٹ ابھر آئی
ہزار مرحلوں سے زندگی گزر آئی — قدم اکھڑ گئے جب راہِ راست پر آئی
بلائے عشق ہزاروں کی جان پر آئی — نجات خلق کی اک آرزو نہ بر آئی
ہر اک زبان پہ چرچا ہے سرفروشوں کا — اجل کے سائے میں کیا زندگی نکھر آئی
عذاب ہوگئی راہِ ثواب ارے توبہ — ہزار بار طبیعت گناہ پر آئی
کوئی بچا نہ زمانے میں جبرِ فطرت سے — لبِ وفا پہ بھی اک آہِ مختصر آئی
کچھ ایسے خاک نشیں اہلِ دل بھی گزرے ہیں — اجل بھی آئی سرہانے تو پوچھ کر آئی

بشر وہ کیا ہے اگر چاند تک پہنچ نہ سکے
زمیں پہ جس کے لیے چاندنی اتر آئی

یہ دور وہ ہے کہیں سے جواب تک نہ ملا
ہر ایک در پہ محبت سلام کر آئی

کسے گلہ ہے حریفوں کی مسکراہٹ کا
ہمیں تو خود بھی ہنسی اپنے حال پر آئی

خدا ہی خیر کرے بے ضرر جہالت کا
بشر کے علم کی تلوار باڑھ پر آئی

کسے نصیب ہے مقتل کا آئینہ خانہ
وہ چچلوں کی جوانی تھی بن سنور آئی

زہے سلیقہ فطرت جہاں بھی آئی ہے
نویدِ امن بہ تقریب شور و شر آئی

ہماری فکر کا انداز دیکھ کر اے نجم
فلک سے کیا یہ غزل کی زمیں اتر آئی

97

بیٹھے ہو کب سے منہ کو موڑے
نام بڑا اور درشن تھوڑے

سوئے ہوئے سے جاگے ہوئے ہیں
کون جگائے کون جھنجھوڑے

کون بلا تھی آس نہ ٹوٹی
اس کی گلی میں پاؤں بھی توڑے

آپ کی کرپا بھی ہے نرالی
دل ہیں کہ جیسے پکے پھوڑے

پریم کا بندھن ٹوٹے کیوں کر
جان چھڑالیں ہاتھ تو چھوڑے

دل کو نہ سمجھو مفت کا سودا
کس نے اپنے ہاتھ مروڑے

نجم یہ اچھی پریم کتھا ہے
دل کے پھپھولے اور نہ پھوڑے

98

اسی کے دم قدم سے ہے یہ شانِ رہبری اپنی
کہاں گم ہوگئی وہ شاہراہِ زندگی اپنی

مری نظروں میں کتنے حادثے آئے تبسم کے
بچھائی اور سمیٹی چاند نے جب چاندنی اپنی

بدلنا ہی پڑا ہم کو بساط دہر کا نقشہ
یہ سمجھے تھے بدل جائے گی حالت آپ ہی اپنی

زہے قسمت اسی کے ہاتھ سے مارے گئے آخر
چھپا رکھی تھی جس نے دوستی میں دشمنی اپنی

کبھی ترمیم کر لیتے ہیں احکامِ شریعت میں
ابھی حد نا خدائی ہے خدا کی بندگی اپنی

ادھر بھی دیکھ لینا اک نظر دورِ سحر والو
چراغ صبح لے کر جا رہا ہے روشنی اپنی

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زور و طاقت کیا
وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

99

بہت بڑھ چلی زندگانی ہماری
کہاں رہ گئی تو جوانی ہماری

محبت نے روکا وفا نے سنبھالا
فرشتوں نے کی پاسبانی ہماری

نہ سمجھے وہ دردِ محبت ہمارا
ہمیں تک رہی مہربانی ہماری

دو عالم تصدق ترے چشمِ نم پر
سنی ہے کسی سے کہانی ہماری

محبت میں روتے ہیں اور جی رہے ہیں
یہ دل اور یہ سخت جانی ہماری

یہ چتون مبارک یہ تیور سلامت
اسی روپ میں تھی جوانی ہماری

حکومت ہے جن کی یہ تجم ان سے کہہ دو
کبھی تھی یہ دنیائے فانی ہماری

100

نہ جسے نظر نے دیکھا نہ جسے خرد نے جانا
یہ جلال و جبر دیکھو اسے مان لے زمانا

مجھے اس روش سے دنیا کی بڑا سکوں ملا ہے
مرے غم کو غم نہ سمجھا مرے دل کو دل نہ جانا

میں ہزار ظلم سہہ کر بھی وفا کا درس دوں گا
مرے عشق پر ہے واجب تمھیں آدمی بنانا

جو زمانہ کی روش پر ابھی ناز کر رہے ہیں
وہ پلٹ کے دیکھتے ہیں تو بدل گیا زمانا

انھیں اپنے دل سے بڑھ کر مرے دل کی قدر ہوتی
کبھی زندگی میں ہوتا جو نصیب چوٹ کھانا

میں گزر تو کر رہا ہوں ابھی درگزر سے لیکن
مرا ہاتھ ہوگا کاری جو پڑے گا ہاتھ اٹھانا

مری زندگی سے اب بھی ترا فاصلہ بہت ہے
مرے دل تک آنے والے مرے دردِ دل تک آنا

یہ بہت بلند منزل ہے میرے شعورِ غم کی
کبھی مسکرا کے رونا کبھی رو کے مسکرانا

مجھے آرزوے نغمہ نہ غمِ تلاشِ مطرب
مرے عشق معتبر کا ہے نفس نفس ترانا

دلِ اہلِ معرفت کو ہے سخن عزیز میرا
مجھے مسند صدارت پہ جگہ نہ دے زمانا

101

کہوں گا کچھ نہ قلبِ ناتواں کی
یہ منزل ہے فریبِ دوستاں کی

کہاں کی رہ گزر منزل کہاں کی
چھٹی جاتی ہیں نبضیں کارواں کی

چمن کی آبرو محفوظ رہتی
لٹا دیتے جو دولت آشیاں کی

ابھی ربطِ جبین و آستاں کیا
یہ سجدہ بھی کڑی ہے درمیاں کی

انھیں آیا نہ طرزِ بندگی بھی
خدائی اور خداوندی کہاں کی

گزرتی ہے یہ جس پر اس سے پوچھو
قیامت ہے خموشی نکتہ داں کی

زباں دانِ محبت ہی نہیں تم
تمھیں کیا قدر ہو اردو زباں کی

فقیرِ رہ گزر کا پوچھنا کیا
زمیں زیرِ قدم ہے کل جہاں کی

مکاں میری نظر میں کیا سمائے
میں وسعت دیکھتا ہوں لامکاں کی

102

زمیں بوئے خوں سے مہکتی رہی
ستاروں کی چھاتی دھڑکتی رہی

زبانوں سے اغماض کرتے رہے
نگاہوں میں دنیا کھٹکتی رہی

بہت کام انسان نے بے جا کیے
بہت عقل انساں جھجکتی رہی

قوانین فطرت نہ بدلے گئے
خرد زور کر کرکے تھکتی رہی

بہت حکمتوں سے سنوارا مگر
نگاہوں سے وحشت ٹپکتی رہی

صداقت کی آنکھیں بھی جھکی نہیں
سیاست کی بجلی چمکتی رہی

قدم جادۂ زہد ہی پر رہے
نظر دشمنوں کی بہکتی رہی

وہ فکرِ سخن کا نشیمن گیا
کہ بلبل نہ تھی اور چہکتی رہی

مسیحا نفس بن گیا آدمی
مگر آدمیت سسکتی رہی

مرے منہ سے جھڑتے رہے پھول نجم
زباں شاخ گل سی لچکتی رہی

103

زخم دل زخم زباں سب سہہ گئے
وقت کے مارے ہوئے چپ رہ گئے

آپ کی دریا دلی بھی دیکھ لی
کتنے دریا آنسوؤں میں بہہ گئے

دے رہے تھے بے عمل درس عمل
ہم بھی سب سن کر سمجھ کر رہ گئے

بے زبانی بھی زباں بن کر رہی
کچھ نہ کہنا تھا مگر کچھ کہہ گئے

حرف حق برداشت کے قابل نہ تھا
کتنی چوٹیں تھیں جو ناحق سہہ گئے

غفلت امروز کے سیلاب میں — کل کے سارے کارنامے بہہ گئے
نجم ہم نکلے جو ارضِ تاج سے — خسروِ بے تاج ہوکر رہ گئے

104

خوب بیٹھے ہیں بہم سمجھے ہوئے — ہم کو تم اور تم کو ہم سمجھے ہوئے
ناسمجھ بھی ہیں یہ غم سمجھے ہوئے — امتیازِ بیش و کم سمجھے ہوئے
دیر تک وہ بیٹھ کر سمجھا گئے — دیر سے بیٹھے ہیں ہم سمجھے ہوئے
جادۂ خیر البشرؐ سے دور ہیں — مسلکِ خیرؐ الامم سمجھے ہوئے
اللہ اللہ آدمی کی بے بسی — جی رہا ہے غم کو غم سمجھے ہوئے
وہ براہ فخر ہیں اہل دول — کیا تجارت کو کرم سمجھے ہوئے
وہ زیادہ سے زیادہ ہوں اگر — جن کو تم ہو کم سے کم سمجھے ہوئے
نجم کتنے ہوں گے عرفی کی طرح — نشتر لا و نعم سمجھے ہوئے

105

گھر میں خزاں کا دور چمن میں بہار ہے — اب اے دلِ غیور تجھے اختیار ہے
میرے لہو سے میرا چمن لالہ زار ہے — کیا اس سے بڑھ کے اور دلیل بہار ہے
ہم اعتبارِ وقت کی حد سے گزر چکے — اب وہ ہیں ان کا وقت ہے اور اعتبار ہے
یارب حسین پھولوں کی غنچوں کی خیر ہو — ہنستے ہیں باغباں کو غرورِ بہار ہے
یہ سوچتے ہیں عیش جنھیں راس آگیا — باقی خدا کے بندوں کو غم ساز گار ہے
میں فرش میکدہ پہ بھی ہوں مثل بوئے گل — واعظ غریب مسند ومنبر پہ بار ہے
کچھ کرلیا اسی نے جو یہ سوچ کر اٹھا — میری ہے جیت سارے زمانے کی ہار ہے
کچھ دل پہ جبر کرنے کی عادت بھی ڈال لیں — کل ہو نہ ہو جو آج انھیں اختیار ہے
درکار شست و شو میں ہو کتنا لہو ابھی — کیا جانے ان کے دل میں کہاں تک غبار ہے

106

وقت کی پرستش کیا آدمی کا مذہب کیا — ملت مہذب کیا قوم نا مہذب کیا

موت کے سوا اب ہے زندگی کا مطلب کیا
دل ٹٹولنے والے دل میں رہ گیا اب کیا

نظم اگر ہے عالم کا بے شعور ہاتھوں میں
فطرتِ منظم کیوں جلوۂ مرتب کیا

کچھ فضا بدلنے دو بے بسی کو ٹلنے دو
یاد آ نہ جائیں گے پھر گناہ کے ڈھب کیا

اپنی زندگی کو جو زندگی سمجھتے ہیں
وہ غریب سمجھیں گے زندگی کا مطلب کیا

ہیں بڑے بڑے دعوے اب تو مہربانی کے
جی گئے تو دیکھیں گے مر گئے تو مطلب کیا

اور بھی کوئی مذہب ہے سوا محبت کے
میرا ہے یہی مذہب پوچھتے ہو مذہب کیا

کچھ مری خموشی سے فائدہ اٹھا لیجئے
آپ کو بھی آتے ہیں بات چیت کے ڈھب کیا

جان بھی نہیں اپنی اور کون اپنا ہو
میرے پاس ہے اب کیا میرے پاس تھا جب کیا

اک نگاہ میں آخر کیسی عذر خواہی تھی
دل میں تھے گلے کتنے ختم ہو گئے سب کیا

انجم سوچتا ہوں میں کچھ مجھے سکوں دے گی
چاندنی کی بارش میں یہ ڈھلی ہوئی شب کیا

یوں تو سو بہانے ہیں انجم کچھ نہ کرنے کے
قصد ہے تو کر ڈالوں آج کل اور اب تب کیا

107

تبسم ہو کہ آنسو چشمِ تر میں
ہم ہی ہم ہیں زمانے کی نظر میں

جہاں وسعت ہوئی فکر و نظر میں
بڑھے کچھ اور آنسو چشمِ تر میں

محبت کے جہاں معبد بنے ہیں
ہمارا خون ہے دیوار و در میں

غرورِ کارواں سے کوئی کہہ دے
بہت مارے پڑے ہیں رہ گزر میں

خبر کیا خانہ بربادوں کی تم کو
خدائی ہے خداوندی ہے گھر میں

شبِ غم رنگ لائی جاتے جاتے
لگا دی آگ دامانِ سحر میں

جفا ہو اپنی حد پر یا وفا ہو
بہت کم ہے محبت کی نظر میں

ابل آنے سے پہلے کچھ نہ سمجھے
بہت کچھ تھا حیاتِ مختصر میں

108

زورِ سخن سے اک جہاں روز بنا بنا دیا
میں نے ہی خود ہزار بار اپنا غرور ڈھا دیا

پاؤں تلے سے ناگہاں کیسی زمیں نکل گئی
کس کو مٹا رہے تھے تم کس نے تمھیں مٹا دیا

ان کے چراغ مہر و مہ میرے بغیر کچھ نہیں
رونقِ آب و رنگ ہے میری نگاہ کا دیا

شانہ بلا زمیں ہلی کانپ گئے دماغ و دل
عمرِ ستم دراز ہو آج مجھے جگا دیا

نظمِ حیات ہے یونہیں سلسلۂ حیات میں
مجھ کو کسی سے کیا ملا میں نے کسی کو کیا دیا

سخت راہ ایک تھی میرے تمھارے واسطے
جس کا تھا دل بڑھا ہوا اس نے قدم بڑھا دیا

نجم خدا سے آج تک راست معاملت نہیں
بندۂ در اسی کا ہوں جس نے مجھے جگا دیا

109

عشق تھا حسن کارساز ان کا
آج کہہ دیں گے ان سے راز ان کا

بے نیازی سے یوں بھلا بیٹھے
جیسے تم تھے جواب ناز ان کا

نالہ نالہ جنون دل میرا
نغمہ نغمہ سکون ساز ان کا

کیا تصور بھی ان کے بس کا نہیں
آئینہ لا شبِ دراز ان کا

آپ بیتی نہیں حقیقت بھی
مرحبا فتنۂ مجاز ان کا

چپ ہوں لیکن یہ خامشی کب تک
ہر کلی تھی چمن میں راز ان کا

عشق اس دن سے کفر کہلایا
جب سے میں ہوں شریکِ نازان کا

دل بہت اہلِ دل کے توڑے ہیں
کیا فسانہ ہے جانگداز ان کا

نجم ہر شعر میں ترنم ہے
آج شاعر ہے نے نواز ان کا

110

راہِ وفا کے راہی کچھ ہم سفر بنالے
مشکل یہ مرحلہ ہے آساں مگر بنالے

میں تو یہ چاہتا ہوں اپنا اسے بنالوں
یوں ہی سہی وہ مجھ کو اپنا اگر بنالے

جادے کی جستجو کیا کیسی تلاشِ رہبر
منزل کر اک معین اک رہ گزر بنالے

دنیا بنا کے لے گا کیا دورِ زندگی میں
میں دل بنا رہا ہوں تو دل میں گھر بنالے

یہ زشت و خوب دونوں مجبور زندگی ہیں
تو اپنی ہر نظر کو لطفِ نظر بنالے

دنیا کے معرکوں میں فاتح رہے گا اکثر
دنیٰ لطافتوں کو تیغ و سپر بنالے

کچھ آسماں سے بھی ہے اونچا میرا تخیل
تو زیرِ آسماں کچھ دیوار و در بنالے

حملے مسرتوں کے چاروں طرف سے ہوں گے
اے غم نواز غم کو پایندہ تر بنالے

کب تک رہیں گے آخر شام وسحر کے شکوے
تو جیسے چاہتا ہے شام و سحر بنالے

ہر عیب سے ہے مشکل دامن بچا کے چلنا
جس عیب کی ہوس ہو اس کو ہنر بنالے

پھر دو جہاں بھی تیرے کون ومکاں بھی تیرے
اپنی نظر کو بالکل اپنی نظر بنالے

تن میں بھی چاہتا ہے من کا اگر اجالا
داغوں کو اپنے دل کے شمس وقمر بنالے

اتنا تو زندگی پر ہے اختیار تجھ کو
آسان تر بنالے دشوار تر بنالے

اے نجم ہر جگہ کچھ درکار ہے سلیقہ
زنداں میں بھی ہو کچھ دن رہنا تو گھر بنالے

111

بُرے بھلے میں کوئی خاک امتیاز کرے
وہ پیرہن ہوں جو یوسف کو کھو کے ناز کرے

نہ اقتدارِ دو روزہ پہ کوئی ناز کرے
کسے خبر ہے وہ کل کس کو سرفراز کرے

خدا جو اجرِ مصیبت سے سرفراز کرے
غریب عشق نہ کیوں درد دل پہ ناز کرے

کھڑا ہوں آئینہ خانہ میں ہاتھ پھیلائے
جہاں میں کیا کوئی دستِ طلب دراز کرے

ہر انقلاب کا ساتھی ہر اقتدار کا دوست
تغیرات کا غم کیوں زمانہ ناز کرے

جو سوچتا ہوں وہ دنیا سے کہہ نہیں سکتا
خدا کسی کو نہ یوں مبتلائے راز کرے

کہیں نہ دل کی طہارت میں فرق آجائے
نظر نہ جانب گل کوئی پاکباز کرے

وہ زور ہے کہ پہنچتی نہیں حقیقت بھی
بجا ہے ناز اگر فتنۂ مجاز کرے

خدا کے بندوں کا بندہ ہے جو خدا کا نہیں
بہت غرور نہ پروردۂ نیاز کرے

جو ایک آنچ محبت کو سہہ نہیں سکتا
وہ کیوں زبان سے تفسیرِ سوز و ساز کرے

کسی میں جان ہے جو ٹوک دے مشیت کو
کرم اگر غمِ عصیاں پہ غم نواز کرے

سکونِ دل سے تمنا ہے ایک سجدہ کی
خدا نصیب اگر فرصتِ نماز کرے

اٹھوں گا اپنے ہی بل پر اگر اٹھا زندہ
نہ میرے حال پہ احسان چارہ ساز کرے

کسی کو نجم خوشی ہو تمہارے غم سے اگر
دعا کرو کہ خدا عمرِ غم دراز کرے

112

کیوں اے فضائے درد کہیں دل نہیں رہا
کیا ہر حق کو خطرۂ باطل نہیں رہا

دل مرکزِ جمال کے قابل نہیں رہا
جب عشق کا شعور ہوا دل نہیں رہا

سجدہ بھی اب تو ان کے مرے درمیاں نہیں
اک یہ بھی نقطۂ حدِ فاصل نہیں رہا

میں نے عمل کی راہ میں ناکامیاں سہیں
تخئیل کامیاب کا قائل نہیں رہا

ہر سر پہ ایک تاج رعونت ہے جلوہ گر
جب سر کسی کا تاج کے قابل نہیں رہا

پہنچا رہِ طلب میں وہ منزل پہ بے تکاں
جس کو خیال دوریٔ منزل نہیں رہا

کیا مسکرا کے موت کی دیتے ہو تم خبر
میں کچھ دنوں سے زیست کا قائل نہیں رہا

وہ کاروانِ عشق سے کس دن الگ رہے
میں کب فضائے حسن میں شامل نہیں رہا

مانگی ہے ان سے موت نہ مانگی تھی زندگی
دامن کبھی یہ دامنِ سائل نہیں رہا

آسانیوں کے دور کا حاصل نہ پوچھئے
سب کچھ ہے صرف حوصلۂ دل نہیں رہا

میں نے لیا ہے قوتِ بازو سے اپنا حق
شرمندۂ نوازشِ باطل نہیں رہا

گمراہ بھی ہوں نجم تو ہوں معرفت کے ساتھ
میں ناشناس جادۂ و منزل نہیں رہا

113

موت کی آغوش میں بھی زیست کا دم خم رہے
کروٹوں پر کروٹیں لے دم میں جب تک دم رہے

حسن کی عظمت اسی میں ہے کہ عہدِ غم رہے
تاقیامت کشتگانِ عشق کا ماتم رہے

زندگی یہ ہے کہ میرے بعد میرا غم رہے
رہتی دنیا تک دلِ بیدار و چشمِ نم رہے

کیا خبر کتنے ابھی آئیں گے ایسے آج کل
آج تم ہی تم سہی کل تک تو ہم ہی ہم رہے

تیز گامی پر نہ جا اے رہنمائے کارواں
ایسے کتنے کارواں آگے بڑھے اور تھم رہے

نقشِ آب و گل کی ایسی خودسری اچھی نہیں
سرکش نافہم گردن میں ذرا سا خم رہے

میرے غم پر اس کا طنز اس کا تبسم سب درست
جھوٹ ہی کہہ دے کوئی ہم غم سے نا محرم رہے

زندگی کی راہ میں کتنا ہجومِ شوق تھا
پا شکستہ چل پڑے ہمت شکستہ تھم رہے

کیا ستم ہے آدمی راضی ہو اس تقدیر پر
دولت دنیا زیادہ آدمیت کم رہے

ذہنِ انسانی ہے رقصاں منزلِ ایجاد میں
دیکھیے کب تک نظامِ عافیت برہم رہے

مجھ سے یہ بھی چاہتا ہے عہدِ روشن آپ کا
شمعِ دانش گل چراغِ زندگی مدھم رہے

رہرووں کو امتیازِ جادہ و منزل نہیں
واہ کیا ادھ بیچ میں اربابِ ہمت تھم رہے

ہم نے دیکھے ہیں یہ منظر زندگی کی دوڑ میں
جو زیادہ سے زیادہ تھے وہ کم سے کم رہے

وہ ہمیشہ لے کے ابھرے اک پیامِ انقلاب
دامنِ دولت پہ جو قطرے لہو کے جم رہے

سوتے سوتے جاگ اٹھی کیفیت شعر و سخن
جس کسی محفل میں پہنچے نجم ہم ہی ہم رہے

114

بے حسوں کو درد کی منزل میں لاسکتا ہوں میں
ضد پہ آجاؤں تو دل سے دل بنا سکتا ہوں میں

میں یہ کہتا ہوں کہ محفل میرے ساتھ اٹھ جائے گی
یہ نہ کہیے تجھ کو محفل سے اٹھا سکتا ہوں میں

لاکھوں پروانے ہیں دنیا میں چراغ دیر کے
آدمی ہوں کفر پر ایمان لاسکتا ہوں میں

مجھ کو واعظ رشک مسجد کی امامت پر ہو کیا؟
جب نمازِ عشق مقتل میں پڑھا سکتا ہوں میں

غم کی یہ تاریک راتیں اور تسلی کا پیام
شمع کی زحمت نہ کیجئے دل جلا سکتا ہوں میں

زیست کے احساس میں ہے مسکراہٹ آپ کی
موت کے احساس میں بھی مسکرا سکتا ہوں میں

اس کو اپنے خانۂ دل میں بلالوں تو سہی
جس کی منزل ڈھونڈ ھ سکتا ہوں نہ پاسکتا ہوں میں

روشنی یکساں ہے میری عرش ہو یا فرش ہو
نجم ہر بزمِ سخن میں جگمگا سکتا ہوں میں

115

غریبوں کی جسارت پر وہ منہ حیرت سے تکتے ہیں
کہ ان کمزور سینوں میں بھی شاید دل دھڑکتے ہیں

کریں کیا بندگانِ وقت حق کہتے جھجکتے ہیں
گلے میں لفظ اظہارِ حقیقت کے اٹکتے ہیں

مزا ہے بے چڑ کہنے کا حق سو بات ناحق ہو
وہ مے نوشوں میں ہیں کم ظرف جو پی کر بہکتے ہیں

نظر والو حقیر و ناتواں ہم ہیں مگر ایسے
کہ آج اتنی بڑی دنیا کی نظروں میں کھٹکتے ہیں

مخالف بھی مزے لیتے ہیں کیا کیا میری ہمت کے
مرا صبر و تحمل دیکھتے ہیں اور بھڑکتے ہیں

بظاہر حاصلِ محفل تبسم ہی تبسم ہے
کسے معلوم کن سینوں میں انگارے دہکتے ہیں

فرشتے گرد بھی ان منزلوں کی پا نہیں سکتے
جہاں ہم خاکسارانِ ازل دامن جھٹکتے ہیں

بہت کم ہیں محبت کی روش کے جاننے والے
جو سر کے بل نہیں چلتے انہیں کے پاؤں تھکتے ہیں

سراپا جرم ہو کر بھی میں بندہ ہوں وہ خالق ہے
کہیں اس طرح کے مضبوط رشتے ٹوٹ سکتے ہیں

ستم ہے جرم اپنے غم کو طشت از بام کر دینا
ہم اپنا درد دل کہتے نہیں ہیں یہ کر تو سکتے ہیں

116

نہ گدائی مجھے دے اور نہ سلطانی دے
فتنہ گر اک نگہِ ناز کی قربانی دے

کن کی آواز پہ کیا جلد لیا میں نے وجود
اور کچھ دے کہ نہ دے دادِ سخن دانی دے

ہم سے دیوانوں کو سجتی ہیں ادائیں ایسی
یوں ترا شوق جسے چاک گریبانی دے

عشق کی فطرتِ فیاض سے کچھ دور نہیں
مجھ کو غم تم کو مرے غم کی پریشانی دے

دست و بازوے ستم سرد ہوئے جاتے ہیں
کوئی مظلوم ترس کھا کے گر انجانی دے

دینے والے تو خدائی مجھے دے سکتا ہے
اک ذرا بڑھ کے محبت کی جہانبانی دے

117

شکستہ ہوش نہیں ہوں شکست پاؤں کیا
ابل پہ ناز ہے کہیے ابل تک آؤں کیا

نظر خود ان کی ہے نیچی نظر ملاؤں کیا
فریبِ حسن سلامت میں دل دکھاؤں کیا

جمی ہے دیر سے پندار حسن کی محفل
غرورِ عشق کا قصہ کوئی سناؤں کیا

یہ سن رہا ہوں کہ آفاق میں تمہیں تم ہو
میں اپنی مستیٔ بیجا کو بھول جاؤں کیا

یہ نازِ حسن مری عاشقی کے دم سے تھے
تمہارے دل میں ہوں بولو زبان تک آؤں کیا

زبانِ شوق کھلی ہے مزاجِ دوست بحال
کسی حسین تمنا کے گیت گاؤں کیا

سوائے غم نہ دیا کچھ تمہارے جلوے نے
یہ سوچتا ہوں تکلف سے مسکراؤں کیا

مرا صحیفۂ اعمال دیکھنے والے
ترے حضور میں ذوقِ گناہ لاؤں کیا

گذار دوں شبِ غم ایک ہی تبسم میں
سحر کے رخ پہ ستارہ سا جگمگاؤں کیا

بجانِ عشق نئی زندگی کی فکر میں ہوں
تری نظر کی بگاڑی ہوئی بناؤں کیا

118

عشق کو حسن بنانے کو چلے
لے تری راہ پہ آنے کو چلے

کارواں آپ ہی منزل تو نہیں　　عمر گزری ہے زمانے کو چلے
تم بھی گھر جاؤ کہ وقت آخر ہے　　ہم بھی اب اپنے ٹھکانے کو چلے
جس جگہ ہوتی ہے دنیا مدہوش　　ہم وہاں ہوش میں آنے کو چلے
حشر کا نام سن آئے ہیں کہیں　　کچھ مرے دوست ڈرانے کو چلے
آشیاں بنتے ہیں آتی ہے بہار　　اک قفس ہم بھی بنانے کو چلے
قابلِ درد کہاں دل میرا　　کیوں گنہگار بنانے کو چلے

119

ان کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے یہ دولت میری　　ہے خیالات کی دنیا پہ حکومت میری
حسن ہے میرا خدا عشق شریعت میری　　آج تک بحث طلب ہے بشریت میری
موت کہلائی شہادت مرے سر دینے سے　　خود یہ خنجر کی زبانی ہے روایت میری
کر چکا وضع نئم عشق کے آئین و اصول　　اب نہ ان کو ہے نہ دنیا کو ضرورت میری
ہے جو اک حال میں عالم ترے جلوہ کی قسم　　رہ گئی ہے ترے آئینہ میں حیرت میری
دل کا کیا ذکر ہے دنیا سمٹ آتی لیکن　　صبر مسلک ہے مرا درد ہے دعوت میری
میں بناتا ہوں حسیں دیکھ کے سر دینے کو　　عشق ہے جوش مرا حسن ہے قدرت میری
نام تو ساتھ نہ جائے گا خدا حافظ ہے　　ایک رہ جائے گی دنیا میں امانت میری
بارہا پیرہنِ عشق میں دیکھا ہے تجھے　　تا ابد ہے ترے جلوہ کو ضرورت میری

120

درد ہے خیال ان کا زندگی ہے خواب ان کا　　عشق حسن فطرت ہوں مجھ سے لو جواب ان کا
گھونٹ خود لہو کے ہم پی کے رہ گئے ورنہ　　خون دل سے بھر دیتے ساغرِ شراب ان کا
حسن بے تماشا بھی کیا کوئی تماشا ہے　　ان کے دیکھنے والے دیکھتے ہیں خواب ان کا
آج میرے شانوں پر منتشر وہ گیسو ہیں　　آج خوابِ ناز ان کا آج نازِ خواب ان کا
عشق کا خمار اپنا کلفتِ خمار اپنی　　حسن کی شراب ان کی نشۂ شراب ان کا

121

میرے ہونٹوں پر تبسم میرے دل میں ہائے ہے | مجھ سے اپنا حال جانے کیسے دیکھا جائے ہے
ہو نہ ہو صبحِ قیامت جانے والے ہم بھی ہیں | بڑھ رہی ہے شامِ غم دیکھیں کہاں تک جائے ہے
جان لب پر آچکی ہے اب گئی اور اب گئی | دیکھئے کب تک ہمارا آنے والا آئے ہے
شاید ان کے درد کی سب منزلیں طے ہوگئیں | دل ہے اب ٹھہرا ہوا سینہ میں دم گھبرائے ہے
اے شہیدِ عشق ہو تیری طرح سب کو نصیب | موت کیسی موت جس سے زندگی شرمائے ہے
آپ دو آنسو بھی اپنے نجم پی سکتے نہیں | پینے والا ڈگڈگا کر زہر بھی پی جائے ہے

122

حریمِ ناز کا پردہ اٹھا کے چھوڑ دیا | نظر جو مجھ سے ملی مسکرا کے چھوڑ دیا
مجھے نزاکتِ ہستی پڑھانے والے نے | فضائے عشق میں قیدی بنا کے چھوڑ دیا
چلے تھے دامنِ دل تھام کر سنبھل نہ سکے | تری نگاہ کے مرکز پہ آ کے چھوڑ دیا
بتوں نے کی تھی مری سمت بھی نگاہِ کرم | مگر خدا کا گنہگار پا کے چھوڑ دیا
ہمیں سے نجم امیدِ ثواب کیا کہنا | ہمیں گناہ کی منزل میں لا کے چھوڑ دیا

123

ان کو دیکھا بے خودی سی ہوگئی | موت آئی زندگی سی ہوگئی
ہم سے پہلے تھا نظامِ عاشقی | ہم جو آئے برہمی سے ہوگئی
آہ کی دل نے وہ جلوہ دیکھ کر | پھر فضا میں خامشی سی ہوگئی
عشق آئینہ تھا ان کے حسن کا | اپنی صورت اجنبی سی ہوگئی
ہم نے کافر سے ملائی تھی نگاہ | ہر طرف پھر بے خودی سی ہوگئی
کس کو سمجھائیں محبت کا اثر | زندگی میں چاندنی سی ہوگئی

124

کہاں ہے محبت کو کیا ہوگیا | تقاضائے فطرت کو کیا ہوگیا
وہ دھڑکن بھی اب دل کی باقی نہیں | گناہوں کی دولت کو کیا ہوگیا

دھواں دل سے نکلا ہے نغمے کجا
یہ سازِ حقیقت کو کیا ہوگیا

مجھے بت پرستی پہ حیرت ہے خود
نظر کی لطافت کو کیا ہوگیا

وہ محشر میں لیں گے حسابِ کرم
یہ چشمِ عنایت کو کیا ہوگیا

ستم ہے کہ تابِ کرم بھی نہیں
کلیجے کی طاقت کو کیا ہوگیا

تماشائے تکرار جلوہ ہے کیوں
اداکارِ قدرت کو کیا ہوگیا

صلہ ہے محبت کا باغِ جناں
خداوندِ نعمت کو کیاہوگیا

سبق شکر کا جب سے تم دے گئے
زبانِ شکایت کو کیا ہوگیا

لبوں پر اب آہیں مچلنے لگیں
غرور محبت کو کیا ہوگیا

125

دردِ دل حاصلِ نظر پایا
ہم نے دل زندگی سے بھر پایا

غم سے کچھ ہوچلی تھی دلچسپی
یہ زمانہ بھی مختصر پایا

ان کے جلوہ کا شور سنتے تھے
ان کے جلوہ کو اک نظر پایا

کوئی حد ہی نہیں ہے منزل کی
ان کی منزل کو رہ گزر پایا

ہائے معصوم زندگی میری
عمر بھر میں خراب کر پایا

126

ہم دکھائیں گے جوش آئے ہو افسانوں میں
حق کی قوت ہے اگر سوختہ سامانوں میں

تم سمجھتے ہو فقط حسن کے ایوانوں میں
زیست اک اور بھی ہے عشق کے میدانوں میں

اتنے مجرم نظر آئیں گے نہ زندانوں میں
جتنے آزاد گنہگار ہیں ایوانوں میں

شوق کی آگ رُکے گی نہ دبے گی اے دوست
اُڑ کے پہنچے گی یہ پروانوں سے پروانوں میں

قیمتی عمرِ ابد سے ہے گذر جائے اگر
ایک ساعت بھی محبت کے زباں دانوں میں

مدفنوں پر جو شہیدانِ محبت کے ملی
مسجدوں میں ہے وہ رونق نہ صنم خانوں میں

کوئی محروم رہے اب نہیں ساقی کو غرض
جتنی میخانوں میں تھی آگئی پیمانوں میں

کیا مٹائے گی ہم ایسوں کو زمانہ کی روش
نام لکھا ہوا ہے کب سے گراں جانوں میں

بس کسی کا نہ چلا موجِ ہوا کے آگے
ایک سیلاب تھا ذرّوں کا بیابانوں میں

روئے گی چشمِ تماشا کہ ہنسے گی اے نجم
تم نظر آؤ گے جب چاک گریبانوں میں

127

وہ دور چلے گا تا بہ کجائے جس کی سبیل عام نہیں
یا رات گزر کر صبح نہیں یا صبح گزر کر شام نہیں

یہ اور ہے کیا اے دوست اگر انصاف کا قتلِ عام نہیں
مردہ ہیں تو ہیں بے گور و کفن زندوں میں ہمارا نام نہیں

پہلو میں برائے نام ہے دل اب درد کا دل میں نام نہیں
مومن ہیں مگر ایمان نہیں مسلم ہیں مگر اسلام نہیں

باقی نہ رہے جب ضبط کی حد اک چیخ نکل ہی جاتی ہے
اندازِ تغافل عام سہی کیا رسمِ بغاوت عام نہیں

کل ہاتھ میں خالی جام تھا اک اب قبضہ ہے میخانے پر
اب اس سے غرض کیا ساقی کو خالی تو کسی کا جام نہیں

جس نام کے بل پر جیتے تھے وہ چھین لیا ناکامی نے
اب کام کی منزل آئی ہے اب نام سے کوئی کام نہیں

ایسے بھی تو مرنے والے تھے جو آج کے دن تک جیتے رہے
میں عزم و عمل کی راہ پہ ہوں یہ موت مرا انجام نہیں

کیا ہم سے چھپائے بیٹھے ہو اظہار کی ساعت آنے دو
محفوظ ہے کتنے سینوں میں وہ راز جو طشت از بام نہیں

معیارِ عمل سمجھے ہی نہیں تم دل کی روش کیا سمجھو گے
مزدور ہوں لیکن ایسا ہوں جس کو ہوسِ انعام نہیں

کچھ خونِ جگر سے لکھنا ہے مجھ کو ابھی لوحِ گیتی پر
الفاظ ابھی الفاظ نہیں پیغام ابھی پیغام نہیں

اے نجم جلالِ معنی ہے الفاظ کے حسن و صورت میں
حاصل ہے یہ پختہ کاری کا سرمایۂ فکرِ خام نہیں

128

محبت کی وہ آہٹ پا نہ جائے
اداؤں میں تکلف آ نہ جائے

تری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی ہیں
کریں کیا جب تجھے دیکھا نہ جائے

کہیں خود بھی بدلتا ہے زمانہ
زبردستی اگر بدلا نہ جائے

حقیقی موت یہ ہے زندگی کی
تڑپ ہو دل میں اور تڑپا نہ جائے

محبت راہ چلتے ٹوکتی ہے
کسی دن زد میں تو بھی آ نہ جائے

وہاں تک دین کے ساتھی ہزاروں
جہاں تک ہاتھ سے دنیا نہ جائے

میں امیدِ کرم پر جی رہا ہوں
یہ دھوکا ہے تو یہ دھوکا نہ جائے

کہاں ہم دردِ دل لے کر چلے ہیں
مزاجِ دردِ دل پوچھا نہ جائے

جوانی تجمّل صاحب کی جوانی اکڑتی جھومتی پھر آ نہ جائے

129

اب اتنی تو ہمت کیے جایئے اجل آئے تک ہی جیے جایئے
غریبوں کے گھر بھی چمکتا ہے چاند ادھر بھی اجالا کیے جایئے
بہرحال ہے میکدہ میکدہ جب آہی گئے تو پیے جایئے
ابھی دل ہے پہلو میں اپنی جگہ نگاہوں کو دھوکے دیئے جایئے
کبھی تجمّل طوفاں اٹھانا بھی ہے کہاں تک یہ آنسو پیے جایئے

130

ترے نام کو رہگزر دے رہا ہوں یہ دنیا ترے نام پر دے رہا ہوں
مرا ہم سفر ہے پیامِ محبت ستارے ستارے خبر دے رہا ہوں
زمیں تا زمیں پاؤں پھیلانے والو میں دشمن کو بھی دل میں گھر دے رہا ہوں
وہ سمجھیں گے کیا لذّتیں درد دل کی کسے زحمتِ درد سر دے رہا ہوں
کہاں تک نہ روئیں مرے حال دل پر میں غم ان کے احساس بھر دے رہا ہوں
مرا سوزِ دل دیکھ لے گا زمانہ گرجتے برستے شرر دے رہا ہوں
محبت کی حد میں جو تم ہو سو ہم ہیں یہ جذبہ نظر در نظر دے رہا ہوں
دلوں کی کشاکش میں میدان لوں گا نہ سر لے رہا ہوں نہ سر دے رہا ہوں
یہاں جو ہے اپنی خبر جانتا ہے میں اے تجمّل اپنی خبر دے رہا ہوں

131

کائناتِ غم کو خاطر میں کہاں لاتا ہوں میں پھول سا دل ہے مگر آہن سے ٹکراتا ہوں میں
اب نقابِ چہرۂ فطرت اٹھاتا ہوں میں سجدہ گاہ فکر میں بڑھتا چلا جاتا ہوں میں
اپنی ہستی سے کبھی وہ منزلت پاتا ہوں میں زندگی کو موت کو دونوں کو ٹھکراتا ہوں میں
مجھ سے اٹھ سکتا نہیں احسانِ اربابِ کرم پھول بھی پھینکے جو کوئی آگ ہو جاتا ہوں میں
دل کی وسعت اور ہے محفل کی وسعت اور ہے بیٹھ جاتا ہوں جہاں کچھ بھی جگہ پاتا ہوں میں

ذہنِ انسانی پہ قبضہ میری مظلومی کا ہے
ظلم ہوتا ہے کسی پر یاد آجاتا ہوں میں

اپنا دل اپنی زباں اپنی نظر اپنا ضمیر
اپنے ہی قبضہ میں ہوں اب کس کے ہاتھ آتا ہوں میں

کل سے کتنے زندگی کے کے دور بدلے آج تک
اور سلجھانے میں الجھاتا چلا جاتا ہوں میں

جادۂ شمشیر ہو زنداں ہو یا دار و رسن
میری جولاں گاہ ہیں جاتا ہوں میں آتا ہوں میں

مشغلے اتنے ہیں تیرے یاد رکھنے کے لیے
تجھ کو اتنے مشغلوں میں بھول بھی جاتا ہوں میں

کوئی خوش خوش جب نظر آتا ہے قید و بند میں
دیکھ کر خود اپنی آزادی کو شرماتا ہوں میں

جب مرے مفہوم کو دنیا سمجھتی ہی نہیں
کچھ نہ کچھ کہہ سن کے اپنے دل کو سمجھاتا ہوں میں

کلمۂ حق ہوں غرور دوست دشمن کے لیے
دیکھتے رہتے ہیں سب دل میں اتر جاتا ہوں میں

کج روی کی چل نہیں سکتی صداقت کے خلاف
راہ ہو جاتی ہے سیدھی جس پہ آجاتا ہوں میں

میری پستی پر نظر کر اپنی ہستی دیکھ کر
اے خدائے آب و گل انسان کہلاتا ہوں میں

نجمِ مغرب کی فضا بھی کانپ جاتی ہے کبھی
گوشۂ مشرق سے وہ پیغام پہنچاتا ہوں میں

132

لب پہ کس کس کا نام آتا ہے
ایک ہی نام کام آتا ہے

وقت کا جب پیام آتا ہے
زد میں ہر اک نظام آتا ہے

ہر نفس تیز گام آتا ہے
کوئی ان کا پیام آتا ہے

منزلیں راستے سے ہٹ جائیں
کاروانِ عوام آتا ہے

پھر مبارز طلب ہوا غمِ عشق
دیکھئے کون کام آتا ہے

فرش پر ان کے خاکساروں کو
عرش سے بھی سلام آتا ہے

ذکر اہلِ کمال پر چپ ہوں
لب پہ اپنا ہی نام آتا ہے

کل ہی ٹھکرا چکے ہیں ہم جس کو
پھر لبالب وہ جام آتا ہے

ہے کوئی راہ روکنے والا
دل سے دل کو پیام آتا ہے

دیکھئے کب تری عدالت کا
فیصلہ بے نیام آتا ہے

موت کی نیند سونے والا ہوں
وقتِ عیش دوام آتا ہے

مرہی جاتا ہوں جب تکلف سے — جینے والوں میں نام آتا ہے
ہوشیار اے رہینِ صحنِ چمن — دانہ آتا ہے دام آتا ہے
کتنا گہرا ہے کس قدر خالی — میرے حصے کا جام آتا ہے
رخصت اے مسندِ حیات و نشاط — موت کا نام جھام آتا ہے
تجم کو دیکھ کر یہ کس نے کہا — شاعرِ تلخ کام آتا ہے

133

کیا سکوں دے گی نئے دور کی روداد مجھے — ہے تباہی گل و گلشن کی ابھی یاد مجھے
پتہ پتہ نظر آنے لگا صیاد مجھے — واہ کیا خوب کیا قید سے آزاد مجھے
راس آئی ہے بہت آپ کی بیداد مجھے — اسی منزل میں تو آیا ہے خدا یاد مجھے
شکر ہے ہوش تو ہے کچھ مجھے بربادی کا — تم تو آپے میں نہیں دیکھ کے برباد مجھے
زندگی غیر کے احسان سے منظور نہیں — آج لے لوں جو ملے مرگِ خدا داد مجھے
دردِ دل پر یہ ملا ان کی سیاست سے جواب — مطمئن کر نہ سکی آپ کی روداد مجھے
سخت جانی سے ہے میری اسی دنیا کو گلہ — اسی دنیا نے کیا موم سے فولاد مجھے
مشتبہ میرا تبسم مرا گریہ مخدوش — یہ وفا کی یہ محبت کی ملی داد مجھے
اپنی ہمت کے مطابق ہے ہر انسان کی فکر — کوئی ناشاد سمجھتا ہے کوئی شاد مجھے
عرض کرتے ہوئے گزرا ہے زمانہ بے سود — دی ہے احساس نے اب ہمت ارشاد مجھے
خیر گذری نہ کھلی وعظ و نصیحت کو زباں — آ گئی اپنے گناہوں کی فضا یاد مجھے
ظلم ہے قوتِ بازو کے سہارے پہ اُدھر — ہے اِدھر صبر کی توفیق خداداد مجھے
ذہنِ عالم پہ شہادت ابھی قبضہ دے گی — ذہنِ قاتل میں کیا ہے ابھی آباد مجھے
میں چمن میں بھی رجز پڑھتا ہوا آیا تھا — لالہ و گل نے سکھائی ہے یہ فریاد مجھے
تجم تقدیر کی گردش سے میں دبنے کا نہیں — پست ہمت نہ کرے وقت کی افتاد مجھے

134

اعلان غیریت کا اب اُردو زباں سے ہے — پوچھے تو کوئی یہ لب و لہجہ کہاں سے ہے

سمجھو نہ یہ مقابلہ اک نیم جاں سے ہے ۔۔۔ رشتہ ہمارا زندگیِ جاوداں سے ہے
سامانِ زندگی سے نہ تاب وتواں سے ہے ۔۔۔ جتنی امید حوصلۂ جانستاں سے ہے
اک دل ہی میرے پاس متاعِ جہاں سے ہے ۔۔۔ اُس کی طلب زمین سے ہے آسماں سے ہے
سنتا ہوں کچھ خلش انہیں طرزِ بیاں سے ہے ۔۔۔ طرزِ بیاں سے کیا ہے مری داستاں سے ہے
کیا زندگی مراد اسی این و آں سے ہے ۔۔۔ مرعوب کس قدر تو زمیں آسماں سے ہے
کثرت سہی گلوں کی چمن بولتا نہیں ۔۔۔ یہ زندگی کی لہر مرے آشیاں سے ہے
طفلی میں بے خرد تھا جوانی میں بے حواس ۔۔۔ میں کیا کہوں گناہ کی منزل کہاں سے ہے
پستی سے بے نیاز بلندی پہ یہ غرور ۔۔۔ جھک کر تو دیکھ تیری بلندی کہاں سے ہے
شامل تو کارواں میں ہوں اب اور کیا کہوں ۔۔۔ اک درد کا سا ربط مجھے کارواں سے ہے
فطرت کا مقتضا ہے یہ اظہارِ دردِ دل ۔۔۔ میرا ہے یہ قصور کہ میری زباں سے ہے
اب تک ہوا نہ تکملۂ ذوقِ بندگی ۔۔۔ کچھ واسطہ جبیں سے ہے کچھ آستاں سے ہے
ان کی خزاں میں دیکھئے کس کی بہار ہو ۔۔۔ جن کی بہار آج ہماری خزاں سے ہے
یہ میرا امتحاں ہے کہ خود اس کا امتحاں ۔۔۔ اک مشتِ خاک کو بھی شرف امتحاں سے ہے
زیرِ قدم زمیں سے توقع نہیں یہاں ۔۔۔ ایسے بھی ہیں امید جنہیں آسماں سے ہے
حیرت سے دیکھتے ہیں خداوندِ ظلم وجور ۔۔۔ اب تک مری زباں کو حذر الاماں سے ہے
اے دوست اس فضا میں حقائق سے ہوشیار ۔۔۔ ذہنی توہمات کی سرحد جہاں سے ہے
دنیا مجھے ضعیف سمجھ کر نہ ہوں دلیر ۔۔۔ اب اس کا سامنا مرے عزمِ جواں سے ہے
تخلیقِ کائنات کا عنوان دیکھنا ۔۔۔ اے نجم ابتدائے محبت کہاں سے ہے

135

ہونا لفظوں میں ادا عشق کا وہ جوش نہ تھا ۔۔۔ میں ترے حسن کا آئینہ تھا بے ہوش نہ تھا
کیا اُگے گا کسی بے کسی کی لحد پر سبزہ ۔۔۔ خاک میں جوش کہاں خون میں وہ جوش نہ تھا
جام کیا جام تھا ساقی نے جو بھر کر نہ دیا ۔۔۔ ڈگمگا کر نہ پیا جس نے وہ مے نوش نہ تھا
کس کی آواز نے اے خوابِ گراں چونکایا ۔۔۔ در و دیوار بتاتے ہیں مجھے ہوش نہ تھا

شکر ہے تا بہ لحد ان کی امانت لایا
حق ہے دنیا جو یہ کہتی ہے سبکدوش نہ تھا

تری آواز تو کرتی ہے عدم کو موجود
تو بھی خاموش تھا گر میں ہمہ تن گوش نہ تھا

فطرتِ حسن ہے اقرار محبت لینا
آج خاموش سہی کل تو وہ خاموش نہ تھا

تری طاعت میں اطاعت کا ہوا حق نہ ادا
تھا میں ناکام پر احکام فراموش نہ تھا

پا گئے عشق کے دامن میں حیاتِ جاوید
اہل باطن کے لیے موت کا آغوش نہ تھا

ہائے کب حضرتِ اخضر نے غزل کہوائی
حجم جب فرطِ الم سے مجھے کچھ ہوش نہ تھا

136

وہ بھی تھا وقت کہ محفل میں تری بار نہ تھا
حشر میں تو کوئی کہہ دے کہ گنہگار نہ تھا

تا دمِ نزع مجھے یاد یہ اقرار نہ تھا
موت جب آئی تو سمجھا کہ میں بیمار نہ تھا

دل کی تقدیر کہ یہ سلح پہ تیار نہ تھا
غم اک آزار سہی درپے آزار نہ تھا

شام کے بھولے ہوئے صبح شبِ غم آئے
صبح وہ صبح قیامت تھی کہ بیمار نہ تھا

سوی گل کس کی پُر از شوق نگاہیں نہ اٹھیں
کون گل گشت چمن کر کے گنہگار نہ تھا

کرب تھا موت کا خمیازۂ صبحِ آغاز
شام انجام کی تصویر تھی بیمار نہ تھا

جی دھڑکتا ہے اسیرانِ چمن ہی سے ہوں
آج سنتے ہیں قفس رونقِ دیوار نہ تھا

میری کشتی تھی خیالات کے طوفانوں میں
تری رحمت نہ سنبھالے تو گنہگار نہ تھا

راہ اب دیکھتے کیا شامِ لحد تھی سر پر
دن ڈھلے تک تو کوئی دل کا خریدار نہ تھا

خودکشی سہل تھی پر نفس کشی کام آئی
یعنی میں خون بہا کر بھی گناہ گار نہ تھا

حجم اک عمر میں احباب پہ یہ راز کھلا
جتنا بدنام تھا میں اُتنا گنہگار نہ تھا

137

عشق حسنِ فطرت ہے دل جو یوں پگھلتا ہے
اپنی روشنی میں آپ مثل شمع جلتا ہے

ہر طرح بہار آئے دل کہیں بہلتا ہے
جوشِ گل ارے توبہ خون سا اُبلتا ہے

یہ جو دردِ الفت سے آتی ہے صدا پیہم
موت سے کوئی اپنی زندگی بدلتا ہے

جادۂ حقیقت سے پاؤں آشنا کیا ہوں
دل کی جب یہ حالت ہے مصلحت پہ ملتا ہے

ایک وجہ تسکیں ہے طاعت و اطاعت کیا حق ادا نہیں ہوتا حوصلہ نکلتا ہے
نجمؔ کے سخن میں اب درد ہے قیامت کا پہلے لعل اُگاتا تھا خون اب اگلتا ہے

138

مرنے والا مرتے مرتے سختیاں دیکھا کیا چارہ گر نبضیں نگاہیں رازداں دیکھا کیا
عالم تخئیل کی بے ربطیاں دیکھا کیا میں زمیں پر رہ کے خوابِ آسماں دیکھا کیا
میں انہیں آنکھوں سے حسن بے نشاں دیکھا کیا ان کا جلوہ چار عنصر درمیاں دیکھا کیا
کرلیا صیّاد کو پابند فکرِ صید نے اک نگہباں تھا کہ میرا آشیاں دیکھا کیا
دل کوئی پہلو میں تڑپا تھا کہ میں دیوانہ وار بزمِ آب و رنگ کی نیرنگیاں دیکھا کیا
کاروانِ رنگ و بوئے گل کی مٹی کی خراب باغباں گل کو خرابِ کارواں دیکھا کیا
سختیاں کرتی گئیں نزدیک مقصد سے مجھے مشکلوں میں دن بہ دن آسانیاں دیکھا کیا
وسعتِ ہمت نے رکھا ہرکس و ناکس سے غیر بیکسی میں حالت درد نہاں دیکھا کیا
ہوگیا وقتِ مناسب نیک و بدپیش نظر سامنے رکھی ہوئی اک داستاں دیکھا کیا
امتحاں ذوقِ نظر کا تھا نموٗ عیب وحسن صانعِ قدرت کی خوش ترکیباں دیکھا گیا
ہر قدم پہلا قدم تھا منزلِ تسلیم میں انتہا تک ابتدائی داستاں دیکھا کیا
وسعتِ دنیا سے باہر تھا مرا ذوقِ نظر ایک جلوہ وہ بھی بے نام ونشاں دیکھا کیا
مجھ کو لے ڈوبا کہاں دنیائے فانی کا شباب راہِ جنت میں شبابِ جاوداں دیکھا کیا
میرے قابو میں نہ تھی اے نجمؔ مرگِ ناگہاں تھیں مقدر زیست کی بدنظمیاں دیکھا کیا

139

یہیں آئے دن رہیں گے جو فسادِ باغباں سے تو قفس میں جارہوں گا میں نکل کے آشیاں سے
میں جہانِ غم میں رہ کر ہوں الگ غم جہاں سے نہ شریک کارواں ہوں نہ جدا ہوں کارواں سے
وہ ستم نصیب لے گا ترا نام کس زباں سے جو اماں طلب ہوا ہو کبھی دورِ آسماں سے
ہے عبث فضول دعوی مجھے جسم ناتواں پر وہ زمیں میں صرف ہوگا جو بچے گا آسماں سے
کبھی محو خوابِ طفلی کبھی بے خودی جوانی مری زندگی کی یارب ہوئی ابتدا کہاں سے

مجھے ہر طرف سے یکساں نظر آ رہی ہے منزل
نہ قفس سے بیر ہے کچھ نہ ہے قرب آشیاں سے

مری بے بسی نے دے دی کبھی آہ کی اجازت
میں قفس میں آگ لایا ہوں چھپا کے آشیاں سے

یہ بہار باغ جنت کی ہوس پہ ہے تعجب
کہ اسیر آب و گل کو یہ ہوا لگی کہاں سے

وہ شباب خواب پیکر پہ جہاں کی بدگمانی
وہ دبی ہوئی لطافت کسی تہمتِ گراں سے

انہیں آج سانس لینا بھی ہوا قفس میں مشکل
جو ہوا میں پھر رہے تھے کبھی سیر آشیاں سے

یہ نمونے جوشِ گل کے میں چمن سے پوچھتا ہوں
کہ نکالے ہیں خزانے یہ دبے ہوئے کہاں سے

یہ سکونِ دل کا عالم کہ گمان بے دلی پر
غم عشق ڈھونڈ لایا یہ تسلیاں کہاں سے

یہ تو نجم آپ کی ہی ہے وہ دوام شعر گوئی
مرے دل پہ چوٹ لگتی ہے صلائے نکتہ داں سے

140

رنگ کچھ سے کچھ ہوا نیرنگِ عالم دیکھ کر
خوئے صرصر دیکھ کر احسانِ شبنم دیکھ کر

بجھ چلا تھا دل مرا زادِ سفر کم دیکھ کر
کیا تسلی ہوگئی سرمایۂ غم دیکھ کر

گریۂ غیر اختیاری ہو کہ اشکِ داد خواہ
پھیر لیتے ہیں نظر وہ چشمِ پُرنم دیکھ کر

نام اُسی کا زندگی ہے گر تو ہوگی موت کیا
شوق مرنے کا ہوا جینے کا عالم دیکھ کر

یہ بھی تھا تقدیر میں دشمن سے آنکھیں جھک گئیں
دوستوں کو پیکرِ انداز مبہم دیکھ کر

جی اٹھی مردہ دلوں کی حسرتِ پامال بھی
انقلابِ عام کے ساماں فراہم دیکھ کر

رہ گئے وہ بیچ میں جی چھوڑ کر اہلِ ہوس
صبر و ضبطِ عشق کے آئینِ محکم دیکھ کر

نجم افراطِ محبت نے مجھے گم کردیا
میں نے آنکھیں بند کرلیں شدتِ غم دیکھ کر

141

لائی غفلت مجھے دنیا کی ہوا کھانے کو
دل بڑھا صحنِ دو عالم سے نکلوانے کو

یاد رکھے گا زمانہ مرے افسانے کو
جی رہا ہوں کسی امید پہ مرجانے کو

شوق واجب نے کیا عشق میں انجام بخیر
لوگ سمجھیں کہ اجل لائی تھی مروانے کو

منحصر تھا حدِ فانوس پہ جلنا مرنا
آتش شوق نہ کافی ہوئی پروانے کو

فتنہ دہر لحد میں نہیں سونے دیتے
حشر سے پہلے ہی موجود ہیں چونکانے کو

کارنامے کہیں مٹتے ہیں وفا کیشوں کے
کیوں وہ اٹھے ہیں نشاں قبر کے مٹنے کو
حجم ہر سانس ہے ممنون فضائے بنگال
اور پَر درد بنایا مرے افسانے کو

142

روتے نہ کٹے اور تڑپتے نہ بسر ہو
کیا قہر ہے وہ رات بھی جس کی نہ سحر ہو
تاحدِ نظر خارِ بیاباں گلِ تر ہو
اے ذوقِ نظر معجزۂ حسن نظر ہو
اب حشر ہو فتنہ کوئی بیدار اگر ہو
آنکھیں جو کھلیں روزِ قیامت کی سحر ہو
نیرنگِ طبیعت ہو کہ نیرنگ نظر ہو
عالم ہو کوئی پھر بھی مری چشم نہ تر ہو
اب منزلِ مقصود ہو یا راہ گزر ہو
وہ بھی تو مسافر ہے جو نیت بہ سفر ہو
دم لے مری آنکھوں میں ذرا برقِ تجلّی
بے وجہ گنہگار نہ آغوشِ نظر ہو
عشق اک نگہہ لطف میں تھا آپ سے باہر
ایسا بھی نہ دنیا میں کوئی دستِ نگر ہو
اے سالکِ بدست مرے دل سے خبردار
جذبات کی دنیا نہ کہیں زیروزبر ہو
ہے جوہرِ قابل میں نہاں سہو و خطا بھی
یعنی کہ فرشتہ نہ ہو انسان بشر ہو
آغوشِ لحد میں بھی نہیں راحتِ کامل
ہم آج چلے جائیں اگر امن کا گھر ہو

143

وہ حسن سے بے تابو اک عشق میں دیوانہ
دو پیکرِ رقصاں ہیں یا شعلہ و پروانہ
اللہ رے تری وسعت اے نغمۂ مستانہ
دو حرف میں پنہاں تھا کونین کا افسانہ
کچھ حد ہے تجلّی کی اے جلوۂ جانا نہ
معمور ہے آبادی معمور ہے ویرانہ
قسمت نے کیا مجھ کو کیا راز سے افسانہ
تھا علمِ الٰہی میں اک دن مرا کاشانہ
اک شعلۂ فانی پر مٹ جائے گا پروانہ
انجام سے غافل ہے آغاز کا دیوانہ
بے لطف سے بیٹھے ہیں کچھ داد و رسن والے
اے عشق وفا پیشہ اک لغزش مستانہ
ترتیب عناصر میں فرق آ ہی گیا اک دن
آخر یہ قفس رہتا کب تک مرا کاشانہ
میں کان لگائے ہوں اک شوق کے عالم میں
ساکت ہے فضا بالکل خاموش ہے ویرانہ
یہ جذبۂ الفت بھی اک قسم جنوں نکلا
دنیائے تمدن کا ایک فعل حکیمانہ

خود حسن چمکتا ہے فطرت کی شعاعوں میں
اسباب نمایش ہیں کیوں آئینہ و شانہ

مظلوم کی آہوں میں بیکس کی نگاہوں میں
اے نفسِ شقی دیکھا قدرت کا ستم خانہ

یہ حکمت آب و گل یہ فطرت رنگ و بو
انداز ملوکانہ سامان فقیرانہ

باہر ہوں تری حد سے اے فلسفۂ دنیا
سو راز پہ بھاری ہے اب بھی مرا افسانہ

اس سروخموشی سے اک پھول بھی ہے بہتر
یہ خندۂ بے معنی یہ گریۂ مستانہ

اے عجم میں پُتلا ہوں رنگ اور تلوّن کا
کس رنگ میں لکھے گی دنیا مری افسانہ

144

جس کو سو آسانیاں تھیں وہ بھی کچھ مشکل میں ہے
میں سمجھتا ہوں تمہارا دل بھی میرے دل میں ہے

جذبۂ دردِ محبت کو مسلسل دیکھ کر
پوچھتا پھرتا ہوں دنیا کون سی منزل میں ہے

ذبح کرتا ہے مجھے روتا ہے میرے حال پر
میری فطرت بھی خدا رکھے میرے قاتل میں ہے

بندگی کا حق بتاتا ہوں خداوندی کو میں
ہاتھ پھیلانے کا دھبّہ دامنِ سائل میں ہے

یاد کر ظالم مرے دل کا تڑپنا یاد کر
حیرتِ جلوہ کا سناٹا تری محفل میں ہے

سعی حاصل میں بھی اک لذت ہے دو دن چار دن
پوچھئے ہم سے مزا جو سعیٔ لا حاصل میں ہے

مرحبا ذوقِ اسیری قدرت فکر و نظر
دہنے بائیں جس کو دیکھا قیدِ آب و گل میں ہے

یہ دعا مانگی مرے دل میں نہ ہو کچھ انقلاب
انقلابِ دہر شامل انقلاب دل میں ہے

دوسری دنیا سے کیوں آئے پیامِ زندگی
روح اپنی کوششیں آزادیٔ کامل میں ہے

عجم یہ خندہ جبینی ہر بلائے عشق پر
کس تبسم کا خزانہ میرے آب و گل میں ہے

145

ان کا سکوں تباہ کئے جارہا ہوں میں
اپنی طرف نگاہ کئے جارہا ہوں میں

دنیا بھی آرہی مرے بعد راہ پر
دنیا کو گردِ راہ کئے جارہا ہوں میں

بندوں سے بے تکان ملاتا ہوا نگاہ
اللہ کے گناہ کئے جارہا ہوں میں

کتنی ہے کفر عشق کی نازش نہ پوچھئے
اسلام کو گواہ کئے جارہا ہوں میں

146

وہ جلوہ گر نہیں تو نگاہوں میں کیا رہے آنکھیں ہوں بند عیب پہ پردہ پڑا رہے
وہ دن بھی تھے کہ آپ مرے ہم نواز ہے جب اپنے دل میں درد تھا درد آشنا رہے
خود باغباں نے ضد میں اُجاڑے ہیں آشیاں ہم تو یہ چاہتے تھے چمن بولتا رہے
ہم رند ہیں مجالِ تقرب کہاں ہمیں واعظ کو حوصلہ ہے وہی باخدا رہے
ذوقِ طلب یہ ہے جو حضوری نہ ہو نصیب در پر گنہگار محبت پڑا رہے
اے دوست یہ شعورِ محبت کا فرض ہے دشمن کی طرح اپنی طرف دیکھتا رہے
دنیا میں اہلِ شر نے جو روکی عمل کی راہ ہم بھی خیال و خواب کی دنیا میں جا رہے
سوچے گی نجم فطرتِ انساں ہمارے بعد کب تک چراغ سوز محبت بجھا رہے

147

شراب و شعر و نغمہ کے اثر کی یاد آتی ہے جگر کی یاد انداز جگر کی یاد آتی ہے
وہ جلوہ اب کہاں اس جلوہ گر کی یاد آتی ہے جدھر اٹھتی ہیں نظریں اک نظر کی یاد آتی ہے
تری محفل میں اربابِ سخن کی نغمہ کاری ہے یہ سنتے ہیں کہ نجم نوحہ گر کی یاد آتی ہے
عدو کیا لطف اٹھائیں گے مری آشفتہ حالی سے مجھے اک دوست کے ذوقِ نظر کی یاد آتی ہے
وطن میں ناروا ہے فتنہ و شر کا تصور بھی مگر پردیس میں ہر خیر و شر کی یاد آتی ہے
زباں پر آکے جس نے دو دلوں میں تفرقہ ڈالا بہت اک ایک حرف مختصر کی یاد آتی ہے
بڑھے جاتے ہیں حد سے محفلِ عشرت کے ہنگامے خدا چاہے تو اب تیغ و سپر کی یاد آتی ہے
تڑپ جاتا ہوں اس نیرنگیٔ تنظیم فطرت پر جب اپنے عیب کی اپنے ہنر کی یاد آتی ہے
خبر کیا تھی کہ ہوگا یوں کبھی احساس تنہائی خدا کی شان گھر میں دشت و در کی یاد آتی ہے
تصوّر بھی چمن کا زہر ہوتا ہے نگاہوں کو قفس میں جب غرورِ بال و پر کی یاد آتی ہے

148

بہت ہیں یوں تو پروانے حرم کی شمع سے پوچھو ابھی کس کس کے سینے میں چراغ دیر جلتا ہے
سکونِ دل کے دو پہلو ہیں اور دونوں معطل ہیں نہ میرا زور چلتا ہے نہ ان کا زور چلتا ہے

زمانے سے شکایت کیا موافق ہو مخالف ہو
زمانہ کیا کسی کو دیکھ کر پہلو بدلتا ہے

سکوں سے دو گھڑی رہنا نہیں اس کے مقدر میں
محبت کا مسافر عمر بھر گرتا سنبھلتا ہے

نہ رونا آئے کیوں کر حالِ نا کامِ محبت پر
وہاں دل کی حقیقت کیا جہاں پتھر پگھلتا ہے

یہ وہ منزل ہے جس میں حسن کا بھی بس نہیں چلتا
لرز جاتی ہے دنیا عشق جب تیور بدلتا ہے

149

درِ ساقی کھلے اک سجدۂ مستانہ ہو جائے
نمودِ شب سے پہلے ختم یہ دنیا نہ ہو جائے

نگاہیں میری ان کی لڑ گئیں ہیں خیر ہو یارب
قرینہ ہے کہ دونوں میں کوئی دیوانہ ہو جائے

محبت جبر کرتی ہے نہ حسن اصرار کرتا ہے
جسے بیگانگی توفیق دے بیگانہ ہو جائے

ہجومِ نا امیدی بڑھ چلا ہے چیخ اٹھوں گا
وہ ساعت آ گئی ہے جب دعا افسانہ ہو جائے

اجازت ہو تو میں دنیا میں کوثر کی بنا ڈالوں
یہاں بھی اک تمہارے نام کا میخانہ ہو جائے

کمی ہے حسنِ منزل میں مرے نورِ محبت کی
میں جب چاہوں مکمل جلوۂ جانا نہ ہو جائے

کوئی پوچھے تمہاری بے نیازی چاہتی کیا ہے
خوشامد کرتے کرتے آدمی دیوانہ ہو جائے

جنابِ شیخ مسجد کی ذرا مشکل ہے آبادی
جہاں کہیے ابھی آباد اک میخانہ ہو جائے

غزل ہو جم میری اور زباں اس نغمہ پرور کی
مرا ہر لفظ ہونٹوں پر اب پیمانہ ہو جائے

150

حسن ہے ان کا ایک قیامت راز قیامت کیا کہیے
ہائے ہمارا حسنِ طبیعت، حسنِ طبیعت کیا کہیے

اب نہ تھمیں گے آنکھ سے آنسو چھیڑ نے والے چھیڑ گئے
خواب سا بیٹھے دیکھ رہے تھے غم کی نزاکت کیا کہیے

آنکھ ملانا کھیل نہیں ہے نامِ محبت کیا لیجے
دل کی رگوں سے کھنچ رہے ہیں روحِ محبت کیا کہیے

151

امرِ حق میں خاموشی حوصلہ کی پستی ہے
اب خدا پرستی کیا مصلحت پرستی ہے

جس کے گوشے گوشے سے زندگی برستی ہے
ایک جنس مہنگی ہے ایک جنس سستی ہے

پستی ہو یا رفعت ہو دنیا ہو یا جنت ہو
آدمی کی رونق ہے آدمی کی بستی ہے

آب و گل کے عنصر میں یہ تضادِ فطرت ہے
عندلیب نالہ کش گل خموش ہستی ہے

152

میرا وہ غم رہا نہ وہ ان کی خوشی رہی
دونوں کے دل بدل گئے دنیا وہی رہی

دیکھا کیے بہت مجھے ترچھی نگاہ سے
کچھ روز دوستی کے لیے دشمنی رہی

جب لے کے درد عشق ہم آئے تو دن پھرے
برسوں یہ کائنات معطل پڑی رہی

اپنا خیال آتے ہی اک حشر آ گیا
جب تک ترا خیال رہا خامشی رہی

دل میں تو ہے وہ شاہدِ مقصود جلوہ گر
آنکھیں بھی دیکھ لیں گی اگر زندگی رہی

سر کرلیا تھا ہم نے محبت کا معرکہ
اللہ جانتا ہے تمہاری کمی رہی

دیکھا تو آج ہے وہی غم رہنمائے دل
سنتا ہوں مدتوں مرے غم پر ہنسی رہی

فتنے اٹھے بہت ہمیں جنبش نہ دے سکے
بیٹھے رہے خموش قیامت کھڑی رہی

نجمی رہی نہ خو ہمیں عجز و نیاز کی
ہم زد پہ تھے مگر یہ بلا دور ہی رہی

153

کون خدا خدا کرے وقت کا مقتضا نہیں
وقت پڑے تو پوچھنا کوئی خدا ہے یا نہیں

سب کو گماں ہے وہ نظر داد طلب ہمیں سے ہے
روئے سخن ہے ہر طرف یہ کوئی دیکھتا نہیں

ان کی بساطِ عیش پر میرے لیے جگہ نہ تھی
کوئی یہ ان سے پوچھتا دل میں جگہ ہے یا نہیں

آئینہِ خیال پر پھر کوئی ابرِ غم اٹھا
رات ابھی سے ہوگئی دن تو ابھی ڈھلا نہیں

ان کو سکون کیوں نہ ہو مجھ کو جنوں کیوں نہ ہو
ان کی جفا جفا تو ہے مری وفا وفا نہیں

میرے لیے بہ فیضِ عشق سارا جہاں خموش ہے
دل کی زبان کھل گئی اب کوئی بولتا نہیں

شمعِ جمال تو بھی کیا طور کے ساتھ بجھ گئی
اب کبھی شوقِ دید میں آگ لگے گی یا نہیں

داغِ وفا تو رہ گئے دامنِ کائنات پر
یوں نہ مٹا سکو گے تم جیسے کبھی میں تھا نہیں

تو ہی خدائے دل سہی کیسے کہوں کہ دل میں آ
دل میں سوائے غم ہے کیا غم ترے کام کا نہیں

154

اُس نظر کی چوٹ کھاکر رہ گئے
ہم ہی تھے جو مسکراکر رہ گئے

واہ کیا مرنے چلے تھے بے اجل
زندگی سے ہاتھ اٹھاکر رہ گئے

جانے والے ان کی منزل کے بہت — دل ہی دل میں پھیر کھا کر رہ گئے
ان کی سچ دھج کا نہ نکلا ایک بھی — نام کیا کیا لب پہ آکر رہ گئے
ہم کہاں تکلیف خود بینی کہاں — دل کو آئینہ بنا کر رہ گئے
کیا قیامت ہے تمھاری سادگی — اچھے اچھے رنگ لاکر رہ گئے
پاک بازانِ ازل پر رحمتیں — کن گنہ گاروں میں آکر رہ گئے
ہم ہی اچھے دل کی دل میں رہ گئی — جو سنا پائے سنا کر رہ گئے
آستاں نزدیک تھا ہم دور تھے — اپنے اوپر رحم کھا کر رہ گئے
خاک کے پتلوں پر ہنستی ہے زمیں — آسماں تک سر اٹھا کر رہ گئے
بڑھ چلے تھے دل کی منزل سے مگر — نجم کچھ آہٹ سی پا کر رہ گئے

155

دشمنی سہی لیکن دوست بن کے مارا ہے — اپنے سر چڑھانے کو میرا بوجھ اتارا ہے
زیست کو بنایا ہے موت کو سنوارا ہے — جب سے آدمیت کا ہم نے روپ دھارا ہے
ہے یہی ہمیشہ سے لین دین دنیا کا — کل یہ سب ہمارا تھا آج سب تمھارا ہے
سب ہی مرد میداں ہیں رزم گاہِ عالم میں — جیت اسی کی ہے جس نے بڑھ کے ہاتھ مارا ہے
تم براہ آزادی سانس لے نہیں سکتے — کل ہزار شکوے تھے آج سب گوارا ہے
موت سے گزرنا کیا زندگی گزار آئے — زندگی تلاطم تھی موت اک کنارا ہے
ایک دن مجھے تم نے بھول کر پکارا تھا — جب سے آج تک میں نے بارہا پکارا ہے
اپنے اپنے موقع پر سب ہی کہہ گزرتے ہیں — کیا تمھیں نے کچھ کہہ کر کوئی تیر مارا ہے
آج تک تو جیتا ہوں اپنے ہی سہارے پر — چاہتے ہیں یہ کہہ دوں آپ کا سہارا ہے
خاک ڈالنے والے تو بجھا نہیں سکتے — دل ہمارے سینہ میں مستقل شرارا ہے
پستی و بلندی میں سب کے کام آیا ہوں — فرش نے صدا دی ہے عرش نے پکارا ہے
حکمت بشر تو یہ خود بشر نہیں سمجھے — ہار کر بھی جیتا ہے جیت کر بھی ہارا ہے
ہم نے منزلت دی ہے نجم نظمِ اردو کو — ہر زمین پر ہم نے آسماں اتارا ہے

156

مسافر ہوں مگر کیا زندگی پر حکمرانی ہے
ٹھہر جاؤں تو باقی ہے گزر جاؤں تو فانی ہے

جب ان کے دل سے کچھ آواز آئے گی تو چونکیں گے
مری فریاد ہے لیکن ابھی میری زبانی ہے

نہ ہم ہیں اب نہ تم ہو کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا
نہ جانے کون سے رخ پر خیالوں کی روانی ہے

ابھی کیسے بھلا دوں گا میں اپنے دل کی بربادی
ابھی تو ان کی نظروں میں غرور کامرانی ہے

وہ مردہ دل جئیں گے خاک جن کا یہ عقیدہ ہو
جہاں تک سانس آتی ہے وہاں تک زندگانی ہے

محبت کا فسانہ ختم کیا ہوگا قیامت میں
قیامت ایک دن کی ہے محبت جاودانی ہے

جوانی آئی جان آئی غم آیا موت آتی ہے
ابھی کیا جانئے کس کس سے طاقت آزمانی ہے

میں پھیلاتا ہوں نورا ے جگر اپنے کنج عزلت سے
زمین شعر میرے دم قدم سے آسمانی ہے

157

امید صبح کیوں دلِ حسرت اثر نہیں
کیا وہ خدائے شب ہے خدائے سحر نہیں

دنیا ہے تنگ دل میرا مدّ نظر نہیں
جو زندگی میں آج نہیں عمر بھر نہیں

آیا سوالِ مرگ تو دیکھوں گا ان کی ضد
ہاں سب کے نام پر ہے مرے نام پر نہیں

اب دل کو چاہیے ترے جلوہ پہ اعتبار
ہم کہہ چکے مجالِ فریب نظر نہیں

دیکھے گی کائنات جو ہم اٹھ کھڑے ہوئے
کروٹ بدل رہے ہیں کسی کو خبر نہیں

جائز سہی نوازشِ کونین کے لیے
محتاج یک نظر مرا ذوقِ نظر نہیں

دنیا کو فکر مفت کرم داشتن ہے کیوں
کرلوں گا خود گناہ فرشتہ اگر نہیں

کیسی سحر میں رات اک اپنی بنا تو لوں
یوں لاکھ بار بھی اگر آئے سحر نہیں

توبہ کے توڑنے کا تکلف نہ پوچھیے
توبہ کا ڈر ہے آج سے پینے کا ڈر نہیں

دشمن بٹھا دیا ہے کوئی اپنی راہ میں
آواز کس طرف سے یہ آئی ادھر نہیں

آنکھوں کا احتجاج کہ اک بار اور بھی
جلوہ کا انکسار کہ بارِ دگر نہیں

شاید مری دعا میں نہ ہو مستیِ دعا
کس منہ سے یہ کہوں کہ دعا میں اثر نہیں

کیا کہہ کہ اپنی حسن سے میں آنکھ پھیرلوں
دنیا کو دیکھنا تو گناہِ نظر نہیں

چلنے کا قصہ ہے تو زمین آسان کیا
کیوں در گزر کروں جو کوئی رہگذر نہیں

شاید چراغ سوزِ محبت کا بجھ گیا
اندھیر ہے کسی کو کسی کی خبر نہیں

158

تجھ میں ہو اگر جرأت رندانہ اٹھالے
پیمانہ ہے جو حاصلِ میخانہ اٹھالے

ممکن ہے کہ ہم سا کوئی دیوانہ اٹھالے
آساں ہو غمِ عشق تو دنیا نہ اٹھالے

جب دل غمِ امروز سے دیوانہ اٹھالے
کیوں بڑھ کے نقابِ رخ فرزانہ اٹھالے

اے دوست بس اب مسندِ شاہانہ اٹھالے
ہمت سے بچھائی تھی دلیرانہ اٹھالے

میخانہ سے اٹھ جاؤں اگر ہوش میں رہ کر
دنیا سے مجھے لغزش مستانہ اٹھالے

دشمن کے لیے تحفۂ جاں لے کے چلا ہوں
ہمت ہو تو یہ ضرب شریفانہ اٹھالے

میں مملکت حسن کا سلطان بنادوں
جو عشق کا اک ناز فقیرانہ اٹھا لے

کاشانہ پہ ہو بار تو جینے کا مزا کیا
اے مردِ عمل دوش پہ کاشانہ اٹھالے

اب دل میرے ہاتھوں پہ سنبھلتا نہیں مجھ سے
بڑھ کر کوئی اپنا کوئی بیگانہ اٹھالے

رستہ میں کہیں ہوش وخرد کھوئے ہیں میں نے
مل جائے تو اے لغزشِ مستانہ اٹھالے

یا حسرت پیمانہ میں ساقی کی طرف دیکھ
یا اپنی طرف دیکھ کے پیمانہ اٹھالے

غم ہے بہت اے دوست خوشی کم ہے جہاں میں
جو کچھ بھی تری ہمت مردانہ اٹھالے

وہ کون ہے اے انجم جو میخانہ میں آکر
ساغر میرے آگے سے حریفانہ اٹھالے

159

نگاہیں میری پہچانے مرا دردِ نہاں سمجھے
کبھی تو کوئی دشمن ہی محبت کی زباں سمجھے

قفس کو جو قفس اور آشیاں کو آشیاں سمجھے
چمن والے سہی رنگِ چمن لیکن کہاں سمجھے

پسینہ کو بھی اپنے جوہرِ تاب وتواں سمجھے
بہت سمجھے ہمارے خون کو جو رائیگاں سمجھے

جوابِ عرض مطلب پر نہیں سمجھے نہ ہاں سمجھے
زباں دانِ محبت کیا سیاست کی زباں سمجھے

ارادے دیکھ کر میرے بلائے ناگہاں سمجھے
اکیلے دم کو یہ اہلِ زمانہ کارواں سمجھے

مسلسل زندگی کی سختیوں نے کروٹیں بدلیں
جواں مردِ محبت موت کی اٹھکھیلیاں سمجھے

کسی دن آسماں کو ہم بنالیں گے زمیں اپنی
زمیں ان کو مبارک جو زمیں کو آسماں سمجھے

یہی شانِ قناعت ہے تو باز آئے قناعت سے
کوئی بے خانماں کیوں کر قفس کو آشیاں سمجھے

میں صورت دیکھتا ہوں سب کی اپنا درد دل کہہ کر
بھری محفل میں یارب کوئی تو کہہ دے کہ ہاں سمجھے

سلامت ہمتِ غم آڑ لی ہے کج کلاہی کی
کہ دل پر آفتیں آئیں ابھی دنیا جواں سمجھے

وہ کیا جانیں محبت میں بلائے رشک شامل ہے
ابھی اپنا ہی غم سمجھے ہیں میرا غم کہاں سمجھے

ملے ایسا تو کوئی سننے والا قصہ غم کا
نظر میری سی ہو میرا سا دل میری زباں سمجھے

یہ سجدے لینے والے اتفاقاتِ بلندی سے
بڑے انسان ہیں انسان کی عظمت کہاں سمجھے

یہی ذوقِ سفر ہے کیا یہی کیا شوقِ منزل ہے
جہاں تھک کر زمیں پر گر گئے آرام جاں سمجھے

کریں گے حجم کیا اردو کے دشمن قدر اردو کی
جو پشتینی سپاہی ہو وہ لشکر کی زباں سمجھے

160

کہنے کو حقیقت کی تلخی پتھر سا کلیجا کون کرے
ناحق کی تو چوٹیں ہلکی تھیں حق بات گوارا کون کرے

دنیا میں نظر بھی حسن بھی ہے یہ ہمت بے جا کو کرے
دل دے کے تو سودے ہوتے ہیں سر دے کے یہ سودا کون کرے

احباب کو اپنا کون کہے اغیار کو اپنا کون کرے
اس آتی جاتی دنیا میں یہ اپنا پرایا کون کرے

بیٹھے تو سہی ہیں مرنے کو مرنے کی تمنا کون کرے
اے گرمئ محفل، محفل سے اٹھنے کا ارادہ کون کرے

منظور ہو کیوں خود داری کو اظہارِ مسرت غم کی جگہ
دل کی تو گرہ کھلتی ہی نہیں آنکھوں سے اشارا کون کرے

اربابِ کرم کی منزل سے سجدوں کے تقاضے ہوتے ہیں
اللہ کو سجدہ جب نہ ہوا انسان کو سجدہ کون کرے

گمراہ سہی اے ذوقِ سفر بڑھتے تو چلے ہی جاتے ہیں

اب راہ پہ قسمت آہی گئی اب راہ کی پروا کون کرے
اخلاص و عمل میں ربط نہیں ایثار سے دل بیگانہ ہے
اسلام ہی جب پلّے میں نہ ہو پھر کفر سے جھگڑا کون کرے
ممکن ہو تمہاری خاطر ہو فریاد سے توبہ کرلینا
احساس تو اپنے بس کا نہیں احساس سے توبہ کون کرے
جلوے بھی جھلک دیتے ہیں مگر جب دیکھنے والی آنکھیں ہوں
دنیا میں اُجالا تم نے کیا آنکھوں میں اُجالا کون کرے
اس نشر گہہ عالم میں کہیں پیغام صداقت ہو تو کوئی
معنی ہیں الگ مفہوم جدا لفظوں پہ بھروسا کون کرے
امید تعاون کس سے کریں پھر جذبۂ دل سو جائے گا
اک موج اٹھی ہے دریا میں اس موج کو دریا کون کرے
کیا ذوقِ نظر کی تسکیں ہو ان چلتے پھرتے جلووں میں
پہلو میں ہمارے دل ہے مگر شایانِ تمنّا کون کرے
اب حسنِ طلب کا لطف نہیں اب دادِ طلب ملتی ہے کہاں
سمجھے بھی کوئی آنکھوں کی زباں نظروں سے تقاضا کون کرے

161

طلب کرتا ہے سجدہ ان کا آئینِ خودی مجھ سے
میں کہتا ہوں کہ سجدہ میرے ان کے درمیاں کیوں ہو

غرورِ حسن ہوتا ہے مگر ایسا نہیں ہوتا
بلندی آسماں تک ہو بلند ہی آسماں کیوں ہو

بڑا دھوکا ہے فطرت کے نظامِ حسن میں ورنہ
تم ایسے خوش خیالوں پر محبت کا گماں کیوں ہو

خدا ناکردہ کوئی اپنا دشمن آپ ہو جائے
یہ کس بل ہے یہ تیور ہیں تو پھر دنیا جواں کیوں ہو

براہِ راست دل لے لو براہ راست جاں لے لو
محبت میں کوئی میرے تمہارے درمیاں کیوں ہو

ہنسی آنے لگی رونے کے بدلے اپنی حالت پر
یہ خمیازہ محبت کا نصیب دشمناں کیوں ہو

شکستہ پا ہو جب اے تجمّل یہ ذوقِ سفر کیسا
دلیلِ کارواں ہونا تھا گردِ کارواں کیوں ہو

162

دل وفا کا مزار کیوں نہ رہے — خواب گاہِ بہار کیوں نہ رہے
ذوقِ غم استوار کیوں نہ رہے — میری جیت ان کی ہار کیوں نہ رہے
داغِ دل شعلہ زار کیوں نہ رہے — تم جہاں ہو بہار کیوں نہ رہے
شوخیِ حکمتِ بشر توبہ — روحِ فطرت پہ بار کیوں نہ رہے
تم ہی مالک سہی زمانے کے — ہم میں اور تم میں پیار کیوں نہ رہے
دوستی میں نزاکتیں ہیں بہت — دشمنی پائیدار کیوں نہ رہے
زندگی میں سکوں نہیں ملتا — موت کا انتظار کیوں نہ رہے

163

راہ پر لا نہ سکی گردشِ ایام مجھے — جھوٹ کہتا ہوں تو منزل پہ نہ ہو شام مجھے
دیکھ اے ذوقِ نظر برقِ تجلّا تو نہیں — نظر آتا ہے کوئی لرزہ براندام مجھے
میری خاطر ابھی زنجیر نے کھولی ہے زباں — ابھی خنجر سے ملے گا ترا پیغام مجھے
کر کے توبہ تری رحمت کا تعین کر دوں — کچھ مناسب نظر آتا نہیں یہ کام مجھے
میری ہی سمت ہیں اب شام و سحر کی نظریں — کہ بنانی ہے نئی صبح نئی شام مجھے
میں ترے نام کی تسبیح پڑھا کرتا ہوں — سننے والے دیے دیتے ہیں ترا نام مجھے
خود پرستی ہے وہ شاید کہ خود آگاہی ہے — حق پرستوں نے دیا ہے کوئی الزام مجھے
کرمِ عام کی جنت مجھے منظور نہیں — آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے کرمِ عام مجھے
صبحِ روشن ہے درخشاں تو یقیں ہے مشکل — آج برسوں میں نگاہوں سے پڑا کام مجھے
جب تک اندازِ ہوس شاملِ پرواز نہ تھا — نہ تو دانہ نظر آیا نہ کہیں دام مجھے
جن کے اقبال کا سورج ہی نہ ہوتا تھا غروب — نظر آتے ہیں وہ خورشید لب بام مجھے
ان کے بگڑے ہوئے تیور میرا دکھا ہوا دل — تجھ اچھا نظر آتا نہیں انجام مجھے

164

دن گزرتا ہے شب آتی ہے سحر ہوتی ہے — جی رہا ہوں تو بہر حال بسر ہوتی ہے

عمر بھر پرورشِ فکر و نظر ہوتی ہے
زندگی پھر بھی اندھیرے میں بسر ہوتی ہے

کچھ غریبوں کی شب ایسی ہی بسر ہوتی ہے
گھر میں اندھیر زمانے میں سحر ہوتی ہے

کس قیامت کی کشاکش ہے دوراہے پہ نہ پوچھ
نہ ادھر ہوتی ہے دنیا نہ اُدھر ہوتی ہے

یہ نہ کہنا پڑے اک دن شبِ عشرت والو
ہائے ایسی بھی زمانہ میں سحر ہوتی ہے

غیرتِ عشق کے تیور ہی کہے دیتے ہیں
یہ نہ پوچھے کوئی کس طرح بسر ہوتی ہے

سوچتا کیا ہے شبِ غم بھی گزر جائے گی
دیکھتا کیا ہے گھڑی بھر میں سحر ہوتی ہے

دل زندہ کہیں لیتا ہے کسی کا احسان
مہرباں موت ہی ہوتی ہے اگر ہوتی ہے

انقلاب آتے ہیں تشکیل توازن کے لیے
وحدت امن جہاں زیرو زبر ہوتی ہے

165

نہ اب اہلِ دل ہیں نہ اب درد والے
محبت کے مالک محبت اٹھالے

اب اس پر بھی ہے غیرتِ عشق راضی
ہمارا نہ بن ہم کو اپنا بنالے

بدلتا نہیں ہے مزاجِ محبت
جفا آزما لے وفا آزما لے

سُنا ہے تمہیں سے تمہیں مانگتے ہیں
بڑے بے جگر ہیں طلب کرنے والے

محبت میں ہے یہ نزاکت کا پہلو
ہمیں کر گئے ہیں تمہارے حوالے

کوئی جان لے کر بھی اب دل نہ دے گا
کہاں دل کے بدلے میں دل دینے والے

کسی کی بڑی کاوشوں کے ثمر میں
یہ گر ہیں دلوں کی زبانوں کے چھالے

وطن میں ہیں جیسے کوئی بے وطن ہو
کسی پر خدا یہ مصیبت نہ ڈالے

یہاں دل ہی دل ہیں اور افسردگی ہے
کہیں ایک دل ہو تو سو دل سنبھالے

جہنم میں جاؤں تو اے حجم رضواں
اٹھاکر جہنم کو جنت میں ڈالے

166

موت سو بار آئے خاطر میں نہ لانا چاہیے
مرتے مرتے زندگی کا گیت گانا چاہیے

جس طرح چاہیں زمانہ کو بدل دیں اہلِ دل
پست ہمت ہیں جنہیں اگلا زمانا چاہیے

آو دل کے مسئلہ کا حل بتادیں ہم تمہیں
بات کرتے ہو تو پہلے مسکرانا چاہیے

جنگ کے سامان کی ہولی جلانا چاہیے
توڑ کر دستِ ہوس ایندھن بنانا چاہیے

خستگیٔ عشق کی رسمِ کہن بدلیں گے ہم
بے خودی کیسی خودی کا رنگ لانا چاہیے

زندگی یہ ہے جدھر ہم ہوں ہوا اُس رخ کی ہو
کون کہتا ہے ہوا کے رخ پہ جانا چاہیے

سر اٹھا کر جلوہ زار ایشیا سے ہر طرف
امنِ عالم کی فضا کو مسکرانا چاہیے

اس قدر بے کیف اگر گزری تو کیا گزری حیات
ایک شب کی شب تو پھولوں میں بسانا چاہیے

رشک دشمن کیا بلا ہے شاد باش دوست کیا
آپ اپنی داد دے کر دل بڑھانا چاہیے

سوچتا ہوں حسن عشوہ کار سے کھا کر فریب
آج موجودات کو اپنا بنانا چاہیے

فرض ہے حفظِ مراتب عزتِ نفسِ حیات
موت سے دو اک قدم آگے ہی جانا چاہیے

پاؤں پھیلانا ہے تہذیب وتمدن کے خلاف
بیٹھنے اٹھنے کا سب ہی کو ٹھکانہ چاہیے

ہلکی ہلکی تھپکیاں کیسی ہوائے لطف کی
زلزلہ کوئی زمینِ دل پہ آنا چاہیے

وسعتِ کونین کم ہے اپنی ہستی کے لیے
اپنے دل میں اپنی آنکھوں میں سجانا چاہیے

آمد و شد ہر نفس کی دے رہی ہے یہ پیام
حق کو آنا چاہیے باطل کو جانا چاہیے

167

ظالم مری نظر میں محبت کا زہر ہے
مجھ سے نظر ملا جو محبت کا ڈر نہیں

عزت کی موت مانگنے نکلا ہوں عشق سے
ذلت کی زندگی مجھے مدنظر نہیں

اومستِ عیش نیند کے مارے ابھی نہ اٹھ
کروٹ بدل رہا ہے زمانہ سحر نہیں

آزادیٔ خیال نہ آزادیٔ عمل
قیدی کی طرح گھر جو نہیں ہے تو گھر نہیں

مجھ پر نگاہ دیر و حرم اٹھ رہی ہے مجم
سجدہ مجھے قبول نہیں ہے کہ سر نہیں

168

شباب نام ہے غفلت کی نیند آنے کا
حوادثات کو قابو نہیں جگانے کا

قلق ہے اشکِ ندامت میں ڈوب جانے کا
ملا نہ خون میں اپنے مزا نہانے کا

نمودِ عشق کو دار ورسن سے کیا نسبت
بہت بلند ہے معیار آزمانے کا

دل حریص ہے مایوسیوں کے نرغہ میں
مزا ملا ہے ہوا پر مکاں بنانے کا

جگہ ملے کہیں سجدہ کی سرگزاروں کو   قفس کا تنگ ہے دامن نہ آشیانے کا
عدم سے جانب ہستی چمن سے سوئے قفس   ہر انتظام میں ہے دخل آنے جانے کا
نیازِ عشق کجا اور نمازِ خوف کجا   ادائے فرض میں ہے فرق سر جھکانے کا
میں زادِ راہ سے محروم اور سفر درپیش   اجل کو ہوش کب آیا مرے جگانے کا
بہت بلند ہے ہستی مری مگر اے نجم   میں ایک ذرّہ ہوں ناسخ کے آستانے کا

169

بھری دنیا پہ جب ڈالی نگاہِ آخری میں نے   تو سوچا کس لیے دودن کو یہ تکلیف کی میں نے
ازل میں لے لیا پورا متاعِ بندگی میں نے   محبت اس سے کیا مانگی خدائی مانگ لی میں نے
لیا ہے نذرِ جاں دے کر مقامِ آگہی میں نے   زمانہ چیخ اٹھا کچھ کہہ کے جب چپ سادھ لی میں نے
کہیں دیکھا نہ اتمامِ صراطِ بندگی میں نے   الٰہی اک نظر میں ساری دنیا دیکھ لی میں نے
وفا کا اعتراف اُس نے زباں سے کرلیا آخر   محبت کی بڑی مظبوط گتھی کھول دی میں نے
خودی ہے بیخودی ہے بندگی ہے کفر ہے کیا ہے   دوا بھی چھوڑدی میں نے دعا بھی چھوڑدی میں نے
نہ پہنچا ایک بھی منعم مقامِ کامیابی تک   لیے ہیں امتحاں کتنے بہ فیضِ مفلسی میں نے
ہنسی آئی مجھے خود یہ دورنگی دیکھ کر اپنی   کبھی زور آزمایا اور کبھی فریاد کی میں نے
خدا رکھے یہ واعظ بے عمل اچھا مقرّر ہے   کہانی سی کہی اس نے کہانی سی سنی میں نے
مجھی کو میری بربادی کا وہ الزام دیتے ہیں   چھپا رکھی تھی جیسے دوستی میں دشمنی میں نے
صدائے عشق آئی حسن کی نازآفرینی پر   ترے قدموں پہ رکھی تھی کلاہِ خسروی میں نے
کوئی آساں نہ تھا اظہارِ درد و مدعا کرنا   بڑی مشکل سے کی الفاظ کی مورت گری میں نے
کسی دن نجم کہنا ہے خدائے بندہ پرور سے   ترے لطف و کرم سے لی ہے تابِ سرکشی میں نے

170

اسے کیا ہو دماغِ خاکساری   جو آلودہ ہے خاکِ سیم و زر میں
سحر بھی آئے گی بزمِ طرب کی   کچھ آنسو جمع کرلو رات بھر میں
مری ایذا پسندی کچھ نہ پوچھو   جگہ کرلی دلِ بیداد گر میں

وہ مل جائیں کبھی میں پوچھ بیٹھوں — یہ کب تک جنگ ہوگی خیروشر میں
عمل ساری حقیقت کھول دے گا — چھپا ہوں اعتباراتِ نظر میں
یہ آزادی یہ آزادی کا جلوہ — چراغ شام ہے مفلس کے گھر میں
ہمارا سا سکونِ دل کہاں ہے — بڑی الجھن ہے اربابِ خبر میں
ہوا ہے میری بے ربطی سے اے تجم — بہت کچھ رابطہ عیب و ہنر میں

171

کعبہ و دیر سے پیام آئے — تیری جانب جو چند گام آئے
لب پہ مستی میں تیرا نام اے — ہوش اتنا کہ نا تمام آئے
عشق کا معرکہ معاذ اللہ — کیسے کیسے جوان کام آئے
پھر مجھے آرزوئے زیست ہوئی — پھر ترے لب پہ میرا نام آئے
یوں بسر کر جہانِ فانی میں — صبح رخصت نہ ہو کہ شام آئے
پھر دکھاتی ہے ان کو قدرت حسن — پھر کوئی خوش نصیب کام آئے

172

کہہ چکے سب کہہ کے اب کیا کیجئے — کچھ نہ کہنے کی تمنا کیجئے
موت آئیگی یہ غم کیا کیجئے — پہلے ماتم زندگی کا کیجئے
درد لیجئے دل کا سودا کیجئے — وہ ازل کا عہد پورا کیجئے
اِک اچٹتی سی غریبوں پر نظر — کام کچھ تو راہِ مولا کیجئے
جان و دل دے کر بھی سستی ہے یہ جنس — کچھ غمِ عشق اور مہنگا کیجئے
میرے دل سے کام لیں گے تا کجا — اپنے دل میں درد پیدا کیجئے
بے نیازی اس قدر کس کام کی — بھولے بھٹکے حال پوچھا کیجئے

173

محبت میں محبت کے تقاضے بھول جاتے ہیں — ہم ان کو یاد کیا کرتے وہ خود ہی یاد آتے ہیں
سحر آتی ہے جب نزدیک تارے جھلملاتے ہیں — یہ ظالم آخری لمحوں پہ اپنے مسکراتے ہیں

جنہیں توفیق دیتی ہے فدا کاری محبت کی
وہ اپنی زندگی دے کر بھی دل سے دل بناتے ہیں

جسے وہ یاد فرمائیں کہیں رکتا ہے روکے سے
زمانہ دیکھتا رہتا ہے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں

ہماری سمت جب اُٹھتی ہے تنقیدی نظر کوئی
ہم اپنا عیب ان کا تذکرہ کر کے چھپاتے ہیں

محبت کا ہے کیا معیار اس کا فیصلہ کیا ہو
کچھ ان کے غم میں روتے ہیں کچھ ان کی دُھن میں گاتے ہیں

بہتر سر دئے ہیں ایک دن میں سرگذاروں نے
بڑی مشکل سے انساں عشق پر ایمان لاتے ہیں

چھپاؤں تجم ان سے کس طرح آثار چہرے کے
جو میرے ضبط غم کو دیکھ کر گھبرائے جاتے ہیں

174

میرے دل میں جو دل تمہارا ہو
دل سے دل کو بڑا سہارا ہو

اس نے الٹی ہیں محفلیں اکثر
جس کو بیگانگی نے مارا ہو

بات ہی اور ہے اشارے کی
بات کیوں ہو کوئی اشارا ہو

مجھ سا خوددار اور یہ وحشت
جیسے تم نے مجھے پکارا ہو

دل ہے دل کا جہاں سوال آئے
وہ ہمارا ہو یا تمہارا ہو

آج میری طرف ہے روئے سخن
اب کسے بے رخی گوارا ہو

ہم ہیں اس بیگناہ کے قائل
جو گنہگار کا سہارا ہو

اس کا عہد حیات کیا جس نے
وقت کٹنے کو دن گذارا ہو

میرے در پر ذرا اُتر آئے
میری قسمت کا جو ستارا ہو

ہم تو ہندوستان والے ہیں
کاش ہندوستاں ہمارا ہو

تجم اس کے خلاف جانا ہے
جس طرح زندگی کا دھارا ہو

175

محبت کم نگاہوں کو نظر میں لا نہیں سکتی
یہ بجلی ہر خس و خاشاک سے ٹکرا نہیں سکتی

جو کہنا ہے کہو حق پر کبھی آنچ آ نہیں سکتی
کوئی طاقت خلوصِ فکر کو جھٹلا نہیں سکتی

گرا کر عرش سے بھی حسن بے پروا نے دیکھا ہے
کوئی عالم ہو میری آدمیت جا نہیں سکتی

متانت آچکی ہے ان کے لہجے ان کی باتوں میں
وہ چاہیں لاکھ چہروں پر متانت آ نہیں سکتی

نہ ہوں فکر ونظر جب تک محبت کی بلندی پر
بشر کی شان خود اس کی سمجھ میں آ نہیں سکتی

نہ سمجھو دوست کی حد تک کمال اپنی محبت کا
ابھی ناقص ہے دشمن کو اگر تڑپا نہیں سکتی

حیات چند روزہ لے تو آئی مجھ کو منزل تک
حریم ناز کا پردہ مگر سرکا نہیں سکتی

میں دنیا سے بچا کر اپنے دل کو حق بجانب ہوں
یہ دنیا میرے دل کی وسعتوں کو پا نہیں سکتی

کبھی تیرِ نگاہ ناز خالی جا نہیں سکتا
کوئی نیکی بھی ایسے وقت آڑے آ نہیں سکتی

نشیمن میرا رہنے دو چمن میں آنچ اگر آئی
نشیمن ہی پہ آئے گی چمن پر آ نہیں سکتی

خوشی ہو یا ہو غم اک ٹھیس ہے دل کی لطافت پر
سمجھ میں ہر کس وناکس کے یہ بات آ نہیں سکتی

گراہوں رو بقبلہ جب بھی ٹھوکر میں نے کھائی ہے
مری خودداری ایسی ویسی ٹھوکر کھا نہیں سکتی

ہمیشہ دل دکھائے گا خدا کی راہ میں واعظ
یہ رندوں کو برا کہنے کی عادت جا نہیں سکتی

کرم پر ان کے آجاتے ہیں آنسو میری آنکھوں میں
مصیبت ہو کسی عنوان کی رُلوا نہیں سکتی

محبت کے عوض ان سے محبت بھی نہ چاہوں گا
مری غیرت کبھی دستِ طلب پھیلا نہیں سکتی

حقائق ہی رہیں گے نجم میری سعی کا حاصل
خیال و خواب میں فکر سخن الجھا نہیں سکتی

نور ہے کہ ظلمت ہے عشق کی بلا جانے
شمع کے اُجالے میں سور ہے ہیں پروانے

حسن جلوہ آرا کی ندرتیں وہی جانے
عشق ایک جذبہ ہے ان گنت ہیں افسانے

کوئی کچھ نہیں کہتا آپ کے تغافل کو
دوست آئے ہیں اب تک سب ہمیں کو سمجھانے

امن کے محافظ بھی ضبط کر نہیں پاتے
جب کبھی چھلک اٹھے درد وغم کے پیمانے

اٹھ گئے ہیں محفل سے کیسے کیسے دل والے
مڑ کے بھی نہیں دیکھا ناشناس دنیا نے

وقت کا تقاضا ہے دوش دیجیے کس کو
ہے کمی حقائق کی بڑھ چلے ہیں افسانے

سب کو مل نہیں سکتا عشقِ دوست کا منصب
دل ڈبوئے ہیں کتنے شوق بے محابا نے

ہم بنانے والے ہیں ہم بگاڑنے والے
کیا کہیں برستے ہیں آسماں سے ویرانے

مجھ کو خود نہیں ہے جب اپنی معرفت حاصل
میں گلہ کروں کس سے کون مجھ کو پہچانے

اعتبار حق ہو یا اعتبار ناحق ہو
آج تک جلایا ہے اعتبار فردانے

آپ اپنی صورت پر خلق کر کے انساں کو   عشق کی بنا ڈالی حسنِ کار فرمانے
تجمّم ہم موحد ہیں ہم پہ کیا اثر ہوتا   بے شمار بدلے ہیں رنگ روپ دنیا نے

177

ہر ایک دوست کو دشمن کو میں پکار آیا   کہ زبانِ محبت کا اعتبار آیا
فضائے شوق میں جو اپنے جی کو مار آیا   حیات موت کی سرحد پہ رستگار آیا
غرورِ عشق میں سر نذر کردیا میں نے   نگاہِ ناز کا ایک قرض تھا اتار آیا
خود اپنے حسن طبیعت کا عیش کیا کم تھا   خیال میں نہ کبھی عیشِ روزگار آیا
رہِ طلب میں بڑی روک تھام تھی لیکن   قدم بڑھا دیئے جس نے وہ ہاتھ مار آیا
شریک حال تھی عہد خزاں میں خود داری   زبان پر بھی نہ افسانۂ بہار آیا
نہ جانے کس کو پکارا تھا اس کی رحمت نے   تڑپ کے میں نے صدا دی گناہگار آیا
نئے نئے جو سُنے ہر فضا میں نام اُس کے   بغیر نام کے بھی میں اُسے پکار آیا
کجا تصورِ حق تہ ملی نہ باطل کی   مرے خدا میں بہت ہاتھ پاؤں مار آیا
لگا کے تجمّم محبت میں آخری بازی   شعورِ فکر و نظر کی رقم بھی ہار آیا
کسی نے اپنی محبت کا تذکرہ جو کیا   مجھے بھی یاد مرا خوابِ خوشگوار آیا

178

عفتِ قلب کے سوا کچھ بھی نہ تھا گناہِ عشق   عقل نے جائزے لیے ذہن گناہ گار کے
دل ہو کہ چشمِ شوق ہو ہیں یہی کردگار حسن   تم ہو نمونۂ حسیں قدرت کردگار کے
عہدِ حیات سربسر عالم انتظار ہے   اہلِ خرد بھی ہیں اسیر وحشت انتظار کے
رند ہیں اب بھی رقص میں ساغرِ مے کے ساتھ ساتھ   بوالہوسوں کا ذکر کیا رہ گئے تھک کے ہار کے
پھر وہی ہم ہیں اور وہی رہگزر فنا کی خاک   رنگ بہت بدل چکے پر ہیں اسی غبار کے
حیرتِ حسن کچھ نہ پوچھ عالمِ عشق کیا کہوں   خاک لحد پہ دیکھ کر نقش جبینِ یار کے
اپنی ہوئی نہ کوئی شئے منظرِ کائنات میں   دل پر کچھ اختیار تھا رہ گئے دل کو مار کے
بزم سخن میں آگئے تجمّم خودی کو چھوڑ کر   بن گئے کب سے آدمی رخت جنوں اُتار کے

179

مرے شعر نشتر نشاں اور بھی ہیں
ترے نام کی چٹکیاں اور بھی ہیں

زر و سیم سے تھیلیاں بھرنے والے
تقاضائے تاب و تواں اور بھی ہیں

ہمیشہ ادھر ہی نہ برسیں گے بادل
زمیں اور بھی بستیاں اور بھی ہیں

ہمیں اک نہیں دور مقصد سے اپنے
زمانہ میں بے ربطیاں اور بھی ہیں

ابھی ایک ہی لی ہے دنیا نے کروٹ
غریبوں کی شہہ زوریاں اور بھی ہیں

تمہیں اپنا بحرِ کرم ہو مبارک
جہاں ہم ہیں پیاسے وہاں اور بھی ہیں

محبت ہے کیوں تجمّ ہندوستاں سے
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

180

اٹھوں گا زندۂ جاوید ہوکر بزم امکاں سے
بڑی جمعیت خاطر ہے اس خوابِ پریشاں سے

خدا محفوظ رکھے چارہ گر کے بار احساں سے
وہ کیا جانے انہیں ہے درد سے نسبت کہ درماں سے

یہ محرومِ تجلّی منہ جو تکتے ہیں پشماں سے
جو بس چلتا تو لذّت چھین لیتے چشمِ حیراں سے

تو ازن کر رہا ہوں اپنے دردِ عشقِ پنہاں سے
غمِ دیر و حرم لے کر مسلماں نا مسلماں سے

جئے تا حشر پر اٹھنا ہے اک دن بزمِ امکاں سے
قیامت ہے جو پیاسِ انساں بجھائے آبِ حیواں سے

بھروسہ کر خدا پر ناخدا وہ بھی تو انساں تھے
سلامت لے گئے جو اپنی کشتی بیچ طوفاں سے

رہے گی قبر پر بھی حشر تک نعم البدل ہوکر
اُداسی ساتھ لے آئے ہیں ہم اسبابِ زنداں سے

خدا جانے نظر کس بدنظر کی لگ گئی دل کو
زمانہ چونک اٹھا تھا اختلاطِ درد و درماں سے

تصور ہی میں ہوجاتا سکونِ عافیت حاصل
کوئی تصویر بن جاتی جو تخئیل پریشاں سے

سنا تھا بے سروسامانیاں مرغوب ہیں ان کی
میں گھبرا کر نکل آیا طلسمِ سازوساماں سے

دلِ ذوق آشنا دیکھیں کہاں سے پھول چنتا ہے
بہارِ عارضی سے یا بہارِ باغِ رضواں سے

کسی دن جا ملے گی روح اس بحرِ حقیقت میں
کہاں تک واسطہ اے تجمّ آب و گل کے زنداں سے

181

جنہیں تم نے خلافِ وقت سمجھا بے محل جانا
انہیں آہوں سے ممکن ہے ہوا کا رُخ بدل جانا

جہنم کے سے تیور ہوں تو ہم جنت کو ٹھکرا دیں
کوئی جنت سے جانا ہے گلستاں سے نکل جانا

ستاروں کی بلندی اپنی پستی دیکھتا ہوں میں
ضیا پاشی سے مشکل ہے مری چتون کا بل جانا

خدا کی شان اُن کو صلح کی کرنی پڑیں باتیں
بہت دشوار نکلا میرا باتوں میں بہل جانا

مبارک منتِ صیاد و ترکِ زحمتِ زنداں
یونہی اے جانے والے موت بھی آئے تو ٹل جانا

قیامت تک اداکارِ محبت یاد رکھیں گے
محبت کے ترانوں کا مرے لفظوں میں ڈھل جانا

جنابِ نجم ہیں مسند نشیں کچھ دن سے زنداں میں
تقاضائے ادب ہے جانے والے سر کے بل جانا

182

مسکراہٹیں سیکھیں قہر کی نگاہوں سے
دادِ سرکشی لے لی ہم نے کجکلاہوں سے

کیا کہیں محبت کا راز کم نگاہوں سے
ہم نے دل بنائے ہیں آنسوؤں سے آہوں سے

طاقتیں مسلّم ہیں علم و عقل کی لیکن
عشق کو تعلق کیا ان پناہ گاہوں سے

اپنی معرفت کا ہم ایک دن سبق دیں گے
دیکھتے چلے جاؤ اجنبی نگاہوں سے

جبر کا شکنجہ تھا میری ناتواں گردن پر
موت نے چھڑایا ہے زندگی کی بانہوں سے

اس کے حق کا مجرم ہوں یہ بھی اس کی رحمت ہے
خود بچالیا مجھ کو مبتذل گناہوں سے

فرش پر ہے تخت ان کا عرش پر دماغ اپنا
کیا فقیر رہتے ہیں دب کے بادشاہوں سے

زندگی کا بھی جن کو حق دیا نہ دنیا نے
حکم انقلاب آیا ان کی قتل گاہوں سے

سارے مسئلے حل ہیں مسلکِ محبت میں
ان کی راہ ملتی ہے بے شمار راہوں سے

نجم یہ نشانی ہے اہلِ دل کی دنیا میں
ہم کو خاص نسبت ہے غم کی بارگاہوں سے

183

زحمت کریں نہ میرے لیے جلوہ گاہ سے
میں آپ آرہا ہوں محبت کی راہ سے

ہلچل ہے زندگی میں غمِ بے پناہ سے
آتی ہے کس کے خون کی بو قتل گاہ سے

جب چل کھڑے ہوئے ہیں تری جلوہ گاہ سے
جو کچھ بھی ہو پلٹ کے نہ آئیں گے راہ سے

کل ذوقِ جستجو کا اڑایا گیا مذاق
بنتی ہے شمع آج مری گردِ راہ سے

ہم بھی خدا پرست ہیں تم بھی خدا پرست
یہ چوٹ کسکے دل پہ لگی لا الٰہ سے

کیا ہوگا فیصلہ مری ذوقِ نگاہ کا
دنیا کو دیکھتے ہیں سب اپنی نگاہ سے

تھا مۓ کا تذکرہ تو بہت مۓ کہیں نہ تھی
ہم سو سلام کرکے اٹھے خانقاہ سے

ہر انقلابِ دہر ہے تمہیدِ انقلاب
طوفان اک اٹھے گا میری قتل گاہ سے

کیا سخت باز پرس ہے میدانِ حشر کی
جیسے کہ سابقہ ہو کسی قرض خواہ سے

ہو زندگی دراز مرے ذکرِ خیر کی
تسکین ہورہی ہے بہت واہ واہ سے

فطرت بھی اپنے فرض سے غافل ہے کس قدر
سنتا ہوں بے نیاز ہیں وہ اشک و آہ سے

اے دوست طے نہ ہوں گی حقائق کی منزلیں
شق تصورات سے ذوقِ نگاہ سے

شاعر سمجھ کے نجم کو سمجھے ہیں سادہ دل
واقف نہیں ہیں آپ بھی اس کجکلاہ سے

184

روئے فرزانگی سیاہ کریں
دل دیوانگی میں راہ کریں

زندگی بھر اِدھر اُدھر دیکھا
آج اپنی طرف نگاہ کریں

غم میں توفیق وہ تبسم کی
کیوں تماشائے اشک و آہ کریں

آؤ دونوں برے بھلے مل کر
جس طرح ہوسکے نباہ کریں

آدمی سے ہو کیوں نظر نیچی
اپنے اللہ کا گناہ کریں

دشمنی میرا کیا بگاڑے گی
دوست بن کر مجھے تباہ کریں

میرزا نجم سے نہ کچھ کہنا
چاہے جو کچھ یہ کجکلاہ کریں

185

ختم دم بھر میں کارِ ہستی ہے
کیا اجل کی دراز دستی ہے

ناز بے جا نہ کر بلندی پر
ہر بلندی کی اصل پستی ہے

کل ہمیں کچھ جنونِ ہستی تھا
آج انہیں کچھ غرورِ ہستی ہے

کتنی مہنگی ملے دریغ نہ کر
پھر بھی عزت کی موت سستی ہے

اپنے اپنے بنا لیے ہیں خدا
ہر پرستش میں خود پرستی ہے

موت کا ایک دن ہے اک ساعت
زندگی رات دن برستی ہے

مہرومہ بھی ہیں نجم دنیا میں　　آدمی سے مگر یہ بستی ہے

186

رازِ ہستی ہے مبتلا ہونا　　کہیں بندہ کہیں خدا ہونا
ہائے آسانیاں نہ ہونے کی　　کیسا دشوار ہوگیا ہونا
نہ ہوئے کچھ جو سوچتے ہی رہے　　درد ہونا ہے یا دوا ہونا
چشمِ احباب میں بھی کھٹکا ہوں　　کیا بُرا تھا مرا بھلا ہونا
آدمیت بغیر دنیا میں　　ہائے وہ آدمی نما ہونا
راس آئے جناب نجم تمہیں　　سالک جادۂ وفا ہونا

187

اس کی دنیا کو برا کہتا ہے کیا کیا کوئی　　خیر ایسی ہی بنادے کہیں دنیا کوئی
دشمنوں سے کرے کس بات کا شکوہ کوئی　　دوستوں میں مرا درد نہ سمجھا کوئی
کار فرما نہ ہو جو طاقتِ یکتا کوئی　　کس سے ترک کرے اپنا ارادہ کوئی
کل کی بات سجائی تھی یہ محفل ہم نے　　آج محفل میں نہیں پوچھنے والا کوئی
ہم نشیں سلسلۂ عیش نہ ٹوٹے ان کا　　کیا قباحت ہے اگر دل کہیں ٹوٹا کوئی
سینکڑوں فتنے اٹھائے اسی دنیا کے لیے　　لے گیا سر پہ اٹھا کر نہ یہ دنیا کوئی
فکرِ عصیاں میں گرفتار ہوں پہ فکر بھی ہے　　میرے اللہ نہ ہو دیکھنے والا کوئی
خواہشِ امن بجا امن کی کوشش برحق　　جب ضرورت ہو اٹھا دیجئے جھگڑا کوئی
ان کی رفتار کے انداز خدا خیر کرے　　جیسے دیکھا ہے نہ گرتا نہ سنبھلتا کوئی
مل گئے آج مقدر سے جناب واعظ　　ہم نے دیکھا نہ تھا دنیا میں فرشتا کوئی
نظر آتی نہیں فطرت کے خزانہ میں کمی　　پیاس کیا خاک بجھائے لبِ دریا کوئی
فطرتِ عشق جو دے ساتھ تو آسکتا ہے　　ساری دنیا کے مقابل تنِ تنہا کوئی
سایۂ حق میں بھی مل جاتی ہے ناحق کو پناہ　　کبھی چھپ جاتا ہے سچّوں میں بھی جھوٹا کوئی
دوستوں سے بھی یہ ہر وقت کا خطرہ ہے مجھے　　میرے دشمن سے نہ لے لے مرا بدلا کوئی

حرفِ حق کے لیے درکار ہے ہمت ورنہ کیا سمجھتا نہیں فطرت کا تقاضا کوئی
رحم اے جذبۂ خود دار جئے گا کب تک اپنے کاندھے پہ لیے اپنا جنازا کوئی

188

دل میں رکھ حال جو دل خواہ نہیں یہ تماشائے سرِ راہ نہیں
اپنے حق میں ہیں حق آگاہ بہت میرے حق سے کوئی آگاہ نہیں
بدگمانی کا گنہگار نہ بن راہ گم کردہ ہوں گمراہ نہیں
زندگی ہے عمل و حُسنِ عمل زندگی آہ نہیں واہ نہیں
اپنے ہم جنس کے آگے بھی نہ جھک تیری منطق میں جو اللہ نہیں
درد ہے درد کسی دل میں بھی ہو تو اسی راز سے آگاہ نہیں
کس حکومت کے ہوا خواہ ہو حجم حجم جب اپنے ہی ہوا خواہ نہیں

189

مسافر ہوں مگر کیا زندگی پر حکمرانی ہے ٹھہر جاؤں تو باقی ہے گزر جاؤں تو فانی ہے
محبت میری رگ رگ میں شرابِ ارغوانی ہے کہاں کا نشۂ مے میرا نشہ جاودانی ہے
جوانی آئی جاں آئی غم آیا موت آئی ہے ابھی کیا جانیے کس کس سے طاقت آزمانی ہے
غلط پڑتی ہیں دردوغم کی بھٹکائی ہوئی نظریں براہ راست جب دیکھے کوئی دنیا سہانی ہے
میں پچھتاتا ہوں کیا کیا اپنا غم کہہ کر زمانہ سے سناتا ہوں جسے کہتا ہے میری ہی کہانی ہے
گمانِ بدغلط راہِ طلب کے ذرّہ ذرّہ پر قدم کیوں کر اٹھیں اپنے ہی دل سے بدگمانی ہے
محبت میں نہ جینے کا ارادہ ہے نہ مرنے کا ابل پر فیصلہ ٹھہرا تو اب جینے کی ٹھانی ہے
مزاجِ درد سے بگڑا ہوا انداز پرسش ہے کہیں ایسا نہ ہو کہہ دوں تمہاری مہربانی ہے

190

کسے غرض تھی جو ہو کی فضا میں جا ملتا تلاش کوئی نہ کرتا اگر خدا ملتا
یقین ہے کہ ستارے جگہ سے ہٹ جاتے قدم جو ہم بھی اٹھاتے تو راستا ملتا
ترے خیال میں ہوتی ذرا بھی جان اگر ترا خیال کبھی تو عمل سے جا ملتا

ابھی تلاش میں اب تک ہے ذہنِ انسانی
کسی طرح سے وہ کھویا ہوا سرا ملتا

سکونِ قلب کوئی رہ گزر کی چیز نہیں
اٹھا کے لے ہی نہ آتے اگر پڑا ملتا

حیات وعلم ونشاط و ملال و دانش ومرگ
بشر کو اور لباسِ بشر میں کیا ملتا

ستم ہی تھا جو کہیں معرفت میں کھو جاتے
جنابِ نجم کہاں آپ کا پتا ملتا

191

اسی کے دم قدم سے ہے یہ شانِ رہبری اپنی
کہاں گم ہوگئی وہ شاہ راہِ زندگی اپنی

مری نظروں میں کتنے حادثے آئے تبسم کے
بچھائی اور سمیٹی چاند نے جب چاندنی اپنی

بدلنا ہی پڑا ہم کو بساطِ دہر کا نقشہ
یہ سمجھے تھے بدل جائے گی حالت آپ ہی اپنی

زہے قسمت اُسی کے ہاتھ سے مارے گئے آخر
چھپا رکھی تھی جس نے دوستی میں دشمنی اپنی

کبھی ترمیم کر لیتے ہیں احکامِ شریعت میں
ابھی ورنہ خدائی ہے خدا کی بندگی اپنی

ادھر بھی دیکھ لینا اک نظر دورِ سحر والو
چراغ صبح لے کر جا رہا ہے روشنی اپنی

سہارا نجم جس کو ہم نہ دیں وہ زور و طاقت کیا
وہ مجلس کیا ہے جس مجلس میں رہ جائے کمی اپنی

192

دیکھوں تو راہِ غم میں کوئی ہم رکاب ہے
کچھ دوست کہہ رہے تھے یہ کارِ ثواب ہے

ظاہر ہے ایک باب نہاں ایک باب ہے
یہ کائناتِ دہر ادھوری کتاب ہے

یہ ظاہری سکوں روشِ اضطراب ہے
اک انقلاب اور پسِ انقلاب ہے

اپنی خرابیوں پہ کسی کی نظر نہیں
ایک ایک کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے

جب دل کا تھا شباب محبت کا دور تھا
اس دور میں دماغ بشر کا شباب ہے

پیدا ہوئے زمانۂ مردہ پرست میں
ناکام زندگی تھی ابھی کامیاب ہے

کچھ اور بڑھ چلوں وہ اگر مطمئن نہیں
اب تک تو صبر ان کے ستم کا جواب ہے

میں اب کسی عذاب کے قابل رہوں گا کیا
ہر اک گناہ اپنی جگہ خود عذاب ہے

وہ بھی تھے خواب کو جو حقیقت بنا گئے
ہم زندگی کو خواب ہی سمجھیں تو خواب ہے

دیکھو تو ان کو دے کے نویدِ سکون مرگ
جن کی حیات اک ہمہ تن اضطراب ہے

تم جس کو اقتدار سمجھ کر ہو بے حواس — یہ عالم خیال میں تعمیرِ خواب ہے
یارب میں زندگی کے عطیہ کو کیا کہوں — درپیش ایک ایک نفس کا حساب ہے
سو جس نے کامیابی کی راہیں بتائی ہیں — وہ ایک میری کوشش ناکامیاب ہے

193

فریضۂ غم الفت نہ کیوں ادا کرتے — یہ کچھ نماز نہیں ہے جسے قضا کرتے
جو دردِ عشق میں دل کو نہ مبتلا کرتے — کسے خبر ہے کہ ہم حال اپنا کیا کرتے
نہ کس طرح تری رحمت کا آسرا کرتے — اگر گناہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے
جو ناتواں ہیں وہ گر کر نہیں اٹھا کرتے — خیال خام یہ رہتا تو جی کے کیا کرتے
حرم کی شمعِ فروزاں ہیں بت کدہ میں سہی — یہاں پہنچ تو گئے ہم خدا خدا کرتے
دعا پہ کیوں دلِ خود دار ہوگیا راضی — ستم ہے شرم جو آئی کہا دعا کرتے
ابھی بہت ہیں یہ دو چار آخری سانسیں — خدا نخواستہ کیوں ترکِ مدّعا کرتے
ترے کرم کی ہے بنیاد مفلسی جن کی — وہ کیوں ترے درِ دولت پہ التجا کرتے
خدا کا شکر کہ دل ہی نہیں رہا ورنہ — ترے سلوک پہ دل سے یوں ہی اٹھا کرتے
جب اہلِ درد سے قربانیاں طلب ہوتیں — ہم اپنے خونِ تمنا سے ابتدا کرتے
عجیب شان کی ہے انتہا پسندی بھی — کہیں تو اپنے ستم کی وہ انتہا کرتے
زہے جلال کہ شاہوں کو دستِ قدرت نے — کیا لحاظ نہ ہم صورتِ گدا کرتے
مزہ تھا جب سرِ منزل غرورِ منزل کا — ہمارے نقشِ قدم کو نہ رہنما کرتے
اگر وہ داد نہ دیتے نیاز مندی کی — تو ہم غرورِ محبت پہ اکتفا کرتے
جو دوستوں پہ بھی چھپ چھپ کے وار کرتے ہیں — بھلا وہ کیا کسی دشمن کا سامنا کرتے
بھلے رہے وہ زمانہ میں ہم نوا ہوکر — خدا کی راہ میں کس کس سے دل بُرا کرتے
میں تجم خود ہی سراپا نیاز ہوں ورنہ — مرے کمال کی چوکھٹ پہ سر جھکا کرتے

194

تدبیر اگر فاتحِ تقدیر نہیں ہے — انسان بجز پیکرِ تصویر نہیں ہے

کیا اب بھی کوئی دور ہے آزادیٔ کامل
اب اک خطِ زنجیر ہے زنجیر نہیں ہے

میں سر بگریباں ہوں تو تنہا ہے زمانہ
خود جرم ہے یہ جرم کی تعزیر نہیں ہے

یوں ہار کے رفتار زمانہ سے نہ بیٹھو
جیسے کہ بس اب موت میں تاخیر نہیں ہے

ان کاتبِ اعمال فرشتوں سے کہے کون
ہر اک عمل قابل تحریر نہیں ہے

اب نیند ہے عزت کی نہ بیداری ہمت
شمشیر نہیں سایۂ شمشیر نہیں ہے

کیوں آئنہ کے سامنے اس روپ میں آیا
پاداش عمل ہے مری تصویر نہیں ہے

آنچ آتے ہی الزام کی دل ہوگیا پانی
کہتا ہی رہا میں مری تقصیر نہیں ہے

مل جائے تو اس وضع سے دنیا کو نہ برتو
جیسے کوئی اس خواب کی تعبیر نہیں ہے

دل کہتا ہے کچھ اور نظر اور زبان اور
کیا بات بنے بات میں تاثیر نہیں ہے

ہاتھ اٹھے ہیں کھلتی نہیں آواز دعا میں
انسان ہوں غصہ تو گلوگیر نہیں ہے

اک حشر بھی اٹھا نہیں رفتار عمل سے
شاید وہ دل آویزی تقریر نہیں ہے

اکسیر نہ کہنا مری خاکستر دل کو
میں خوش ہوں کہ دل خاک ہے اکسیر نہیں ہے

الفاظ بھی آزاد ہیں انداز بھی آزاد
قسمت سے کوئی دست بہ شمشیر نہیں ہے

دل موم بناؤں غمِ ہستی میں کہ فولاد
یارب یہ مرے ہاتھ کی تعمیر نہیں ہے

بسمل تمہیں کردیتا ہے کیوں لفظِ محبت
اک بات ہے تلوار نہیں تیر نہیں ہے

میں غالبؔ و ناسخؔ کا ہم آواز ہوں اے نجمؔ
بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں ہے

195

جیسے میں الٹے قدموں رستہ سے پھر چلوں گا
راہِ وفا کے ذرّے آنکھیں دکھا رہے ہیں

دیکھی ہے ہم نے دنیا رازِ کرم نہ پوچھو
صبر آزما چکے اب جبر آزما رہے ہیں

کیا سانس اکھڑ رہی ہے کیا دم الٹ رہا ہے
ہم شامِ زندگی کا اک گیت گا رہے ہیں

اک نقش آب و گل کو جلوہ بنا دیا ہے
اے حسن کے تماشے ہم دل بڑھا رہے ہیں

کوئی خودی سمجھ لے یا بیخودی سمجھ لے
دنیا خراب کرکے اک گھر بنا رہے ہیں

میرے سکون غم پر اب حُسن مضطرب ہے
خودداریوں کے صدقے جلوے بلا رہے ہیں

میں عشق کے تصدق انسان بن گیا ہوں　　زیر قدم فرشتے آنکھیں بچھا رہے ہیں
میں سوچتا ہوں دل ہی اس سمت بڑھ رہا ہے　　میں دیکھتا ہوں وہ بھی نزدیک آ رہے ہیں

اشکوں کی رو میں نجمی دل کا لہو بہا کر
غم کی نوازشوں کو رنگیں بنا رہے ہیں

○

der\Graphic2
not found.